ماہنامہ

نقوشِ راہ

نقوشِ راہ دکھاتے چلو زمانے کو
قدم قدم پر مسافر پریشان بیٹھے ہیں

August 2021

ہجرت کا پیغام

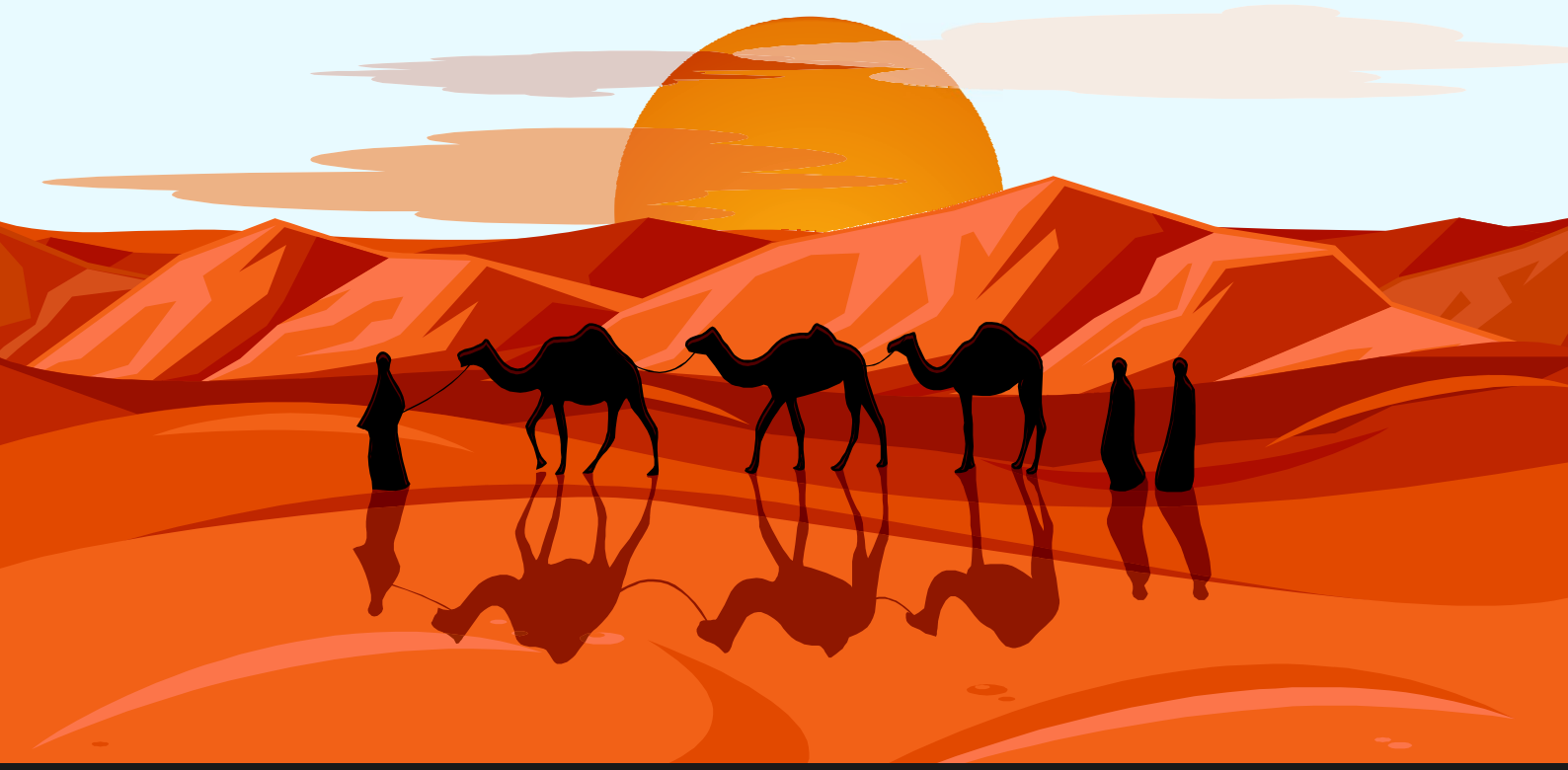

اس شمارے میں

★ تحریک اسلامی کا تعارف
★ ہجرت مدینہ کا پیغام
★ افغانستان عالمی طاقتوں کا قبرستان
★ کیا بھارت کے لوگ آزاد ہیں؟

گائیڈنس پبلیشرز کی اہم مطبوعات

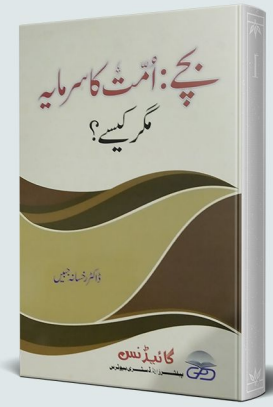

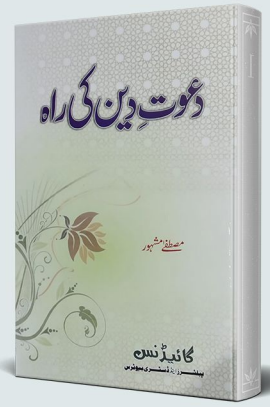

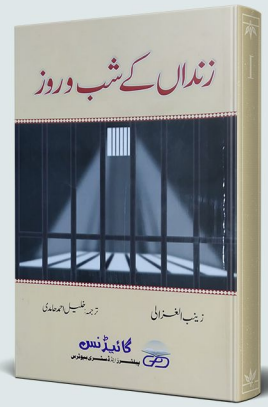

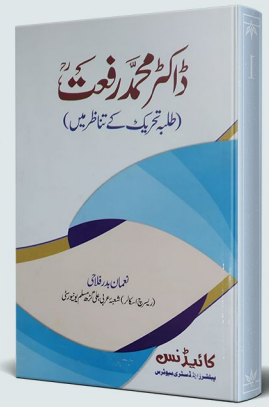

LIMITED TIME ONLY

ORDER NOW

CALL: 9599693655

gpddelhi2018@gmail.com

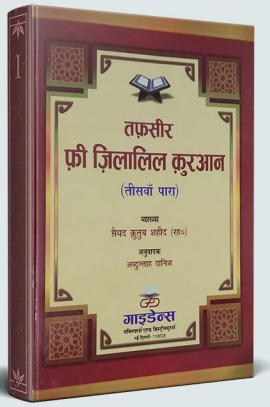

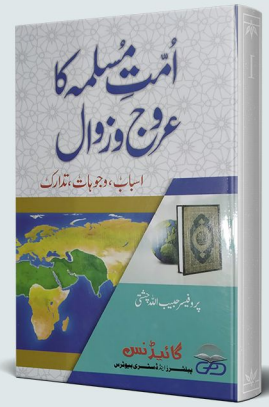

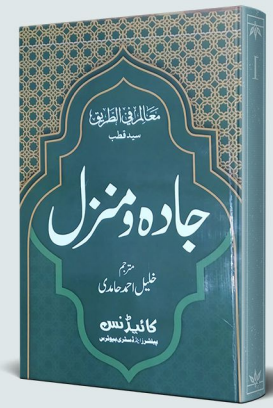

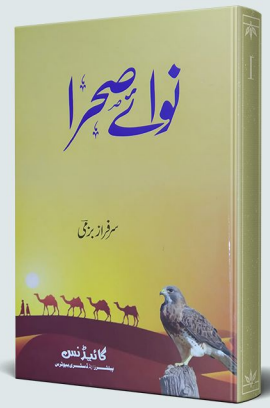

ایمان لانے والوں کا کارساز اللہ تعالیٰ خود ہے، وہ انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے۔ (القرآن)

ماہنامہ

نقوشِ راہ

Islamic Youth Federation

اسلامک یوتھ فیڈریشن (IYF) کا ترجمان

جلد: 04 شمارہ: 5

اگست 2021ء، ذی الحجہ/محرم الحرام ۱۴۴۲-۱۴۴۳ھ

فہرست مضامین

اداریہ	معاذ احمد جاوید	04
درسِ قرآن	عبید الرحمن ابو حذیفہ	05
درسِ حدیث	اسامہ احسن صدیقی	07
افغانستان عالمی طاقتوں کا قبرستان	ڈاکٹر محمد مبشر خاں	10
تحریک اسلامی کا تعارف	احمد اسامہ جعفری	15
یوم جمعہ کی اہمیت وفضائل	شاہد علی پوسد	18
ہجرت مدینہ کا پیغام	محمد مدثر ایچولوی	20
ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی	مختار احمد مکی	23
اسرائیل کی تعمیر میں اشتراکی ممالک کا کردار	خلیل احمد حامدیؒ	27
چند ذہنی الجھنیں اور ان کا حل	سید اسعد گیلانی	30
کیا بھارت کے لوگ آزاد ہیں؟	حذیفہ جاوید	35
گوشۂ خواتین: سفر ہجرت اور صحابیات	ثمرہ یعقوب فلاحی	38
گوشۂ اطفال: اچھے بچے ایسا کام نہیں کرتے ہیں	جاوید اقبال	40
گوشۂ اطفال: میری کتاب	جاوید اقبال	41
اشعار وتشریح	شیر خالد	42

چیف ایڈیٹر
معاذ احمد جاوید

ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد مبشر

معاون ایڈیٹر
اُسامہ عظیم فلاحی

مجلس ادارت
- پرویز نادر
- فیض الرحمٰن
- حذیفہ احمد جاوید
- صابر محفوظ فلاحی

سرکولیشن منیجر
پرویز نادر

زرتعاون

فی شمارہ: -/20

سالانہ: -/220

Current A/c Name: Nukush E Rah
A/c No : 9650 2011 0000 482
Bank of India - Akola Branch
IFSC : BKID0009650

Printer, Publisher and Owned by Shaikh Nisar Shaikh Chand Printerd at Super Printing Press, Telipur Chowk, Akola, Published at 1st Floor, Opposite Basera Aprartment, Subhash Chowk, Akola.-444001
Editor: Shaikh Nisar Shaikh Chand

اداریہ

زندگی حرکت وعمل سے عبارت ہے۔افراد کی طرح قوموں پر بھی یہ حقیقت صادق آتی ہے۔زندہ قومیں ہمیشہ آگے کی جانب سفر کرتی رہتی ہیں اور اپنے نقوش تاریخ کے اوراق پر ثبت کرتی جاتی ہیں۔مثبت اقدام کے لئے افراد کی طرح قوموں کی بھی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کا آج گذرے کل سے بہتر ہو۔وہ نامساعد حالات سے گھبراتی نہیں، کیونکہ ان کو معلوم ہے کہ بادمخالف کی تندی تو ان کے عزائم اور حوصلوں کو تقویت دیتی ہے اور ان کو اونچائی کی جانب پرواز کرنے میں مدد کرتی ہے۔امت مسلمہ اسی کاروان سخت جاں کا نام ہے۔ماضی وحال اس کے گواہ ہیں۔قوموں اور گروہوں کی زندگی میں عروج وزوال تو ایک مستقل عمل ہے۔لیکن بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کو کبھی زوال نہیں ہے۔

بقول اقبال: جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

قوموں کے عروج وزوال کے ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ جب جب اور جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنے معاملات کا جائزہ لے کر اس کی روشنی میں اپنے نقائص دور کئے، ان کے سامنے عروج کی راہیں کھلیں اور وہ امامت اور سیادت کے منصب پر فائز ہوئے۔

ملت اسلامیہ ہند کا ماضی بھی تاریخ کا سنہری باب ہے۔امت کی اس شاخ نے ہمیشہ سے عالم اسلام کے جذبات واحساسات کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ رکھا، یہاں تک کہ جب امت کی امنگوں کے مرکز خلافت عثمانیہ کے زوال پر رونے والے کم ہی لوگ بچے تھے، اس وقت ہندی مسلمانوں نے تحریک خلافت کے ذریعہ امت کے جذبات کی بھرپور نمائندگی درج کرائی۔یہ وہ دور تھا جب مسلمان ہندوستان میں بسنے والی تمام اقوام کے قائد ورہنما سمجھے جاتے تھے۔لیکن اس کے بعد سے اب تک سو برس کے عرصہ میں گنگا میں بہت سا پانی بہ گیا۔کل کے قائد آج راندۂ درگاہ ہیں۔کل جن پر بہاریں پھول برسا رہی تھیں، آج ان پر خزاں کے کالے بادل منڈلا رہے ہیں۔ہندی مسلمانوں کا پستی کی جانب یہ سفر کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ قانون الٰہی کے مطابق ہونے والی تبدیلی ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''یہ تو زمانے کے نشیب وفراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔'' (آل عمران)

گردش ایام کو تبدیل کرنے کی تگ ودو میں ہم کہیں سماجی پستی کا رونا روتے ہیں تو کہیں معاشی بدحالی کا، یا پھر کچھ لوگ تعلیم اور انتظامیہ میں مسلمانوں کی کم نمائندگی کی تان چھیڑ دیتے ہیں۔ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہی مسائل میں ہمارے درد کا درماں ہے۔نتیجتاً اس ''بین الاقوامی ریس'' میں ہم مسلمانوں کو بھی دیگر قوموں کے ساتھ لائن میں لگا دیتے ہیں۔لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ صرف ناکامی اور مسائل کا کبھی نہ رکنے والا طوفان۔آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ بقول اقبال، قوم رسول ہاشمی کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انداز میں ترتیب دیا ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ دیگر اقوام کے معیار ترقی پر خود کو نہ جانچیں۔امت مسلمہ وہ قافلۂ حق ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے مشن کو اس دنیا میں پورا کرنا چاہتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اور اس طرح ہم نے تم کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔'' (البقرہ) یہ ہے اس امت کا مرتبہ، جس کا تقاضہ یہ ہے کہ رسولؐ اللہ کے ذریعہ سے پہنچائی گئی فکر صحیح اور عمل صالح کی تعلیم کو، رسولؐ کے قائم مقام کی حیثیت سے دیگر اقوام عالم تک منتقل کیا جائے۔قرآن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے 'امر بالمعروف ونہی عن المنکر' کو مسلمانوں کا بنیادی فریضہ بتایا ہے۔یعنی سماج میں نیکی اور بھلائی کا فروغ اور بدی کی طاقتوں کا زور توڑ دینا، اس امت کا بنیادی کام ہے۔یہ خدائی مشن ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے تمام چھوٹے بڑے مسائل کا جائزہ اس کی روشنی میں لیں۔ ہمارا دوبارہ عروج اسی مشن سے وابستہ ہے۔

قرآن بارہا اس بات کو یاد دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو رسوائی اور ذلت سے کبھی دوچار نہیں ہونے دے گا۔مومنین کی مدد کو اس نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ فرمایا: ''اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے اور اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے۔'' (الحج) اس بشارت میں یہ نقطہ پوشیدہ ہے کہ مومنین زمانے میں معزز ہوں گے، زمین وآسمان کی ساری قوتیں ان کی معاون ومددگار ہوں گی۔کیوں کہ اللہ رب العزت جو تمام کھلی اور چھپی طاقتوں کا مالک ہے، جب پشت پناہی کا وعدہ کرے، مدد اور تعاون پر آجائے تو پھر کس بات کا ڈر۔لیکن یہ وعدہ محض زبانی دعوۂ ایمان پر نہیں بلکہ اس وعدہ کو وفا کرنے پر ہے، جو ہم نے ایمان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ سے کیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ 'ہم ایمان لائے' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ (العنکبوت) یہی ایمان تھا جس کے نتیجہ میں صحابہ کرام نے رسولؐ کا تنگی، آسانی، غربت وراحت ہر حالت میں ساتھ دیا۔یہ وہ ایمان تھا جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ: ''حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر وہ ہرگز شک میں نہ پڑے اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی سچے لوگ ہیں۔'' (الحجرات)

آج ہمارا ایمان شک وریب کا شکار ہے۔ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ محض زبانی دعوے کی بنیاد پر ہی بارگاہ ایزدی میں سرخ رو ٹھہریں گے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر بنیادی فرائض کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور فروعی مسائل تک اپنے آپ کو محدود کیے ہوئے ہیں۔باطل کے غلبہ نے ہمارے حواس اس قدر باختہ کر دیئے ہیں کہ ہم ان لوگوں کا ساتھ دینے سے بھی کتراتے ہیں جو اپنی دانست بھر 'شہادت علی الناس' کا فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔ہم اندیشوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ کہیں ہماری جمی جمائی دنیا نہ اجڑ جائے۔جب کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے کہ: ''اے نبیؐ! دنیا کے ملکوں میں اللہ کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے۔پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے، جو بدترین جائے قرار ہے۔'' (آل عمران) یعنی مشیت الٰہی کی جانب سے ناہنجاروں کو مہلت دی جاتی ہے، لیکن یہ مہلت ابدی نہیں ہے بلکہ ایک خاص مدت تک کے لئے ہی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دنیا کے دھوکے سے نکلیں اور حقیقی مشن سے وابستہ ہو کر ابدی زندگی کو کامیاب بنانے کی جدوجہد کریں۔

(معاذ احمد جاوید)

درسِ قرآن

عبیدالرحمٰن ابوحذیفہ

بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيمِ

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللهَ إِنَّ اللهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۸) وَلاَ تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۱۹) لاَ يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ (۲۰) لَوْ أَنزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعاً مُّتَصَدِّعاً مِّنْ خَشْيَةِ اللهِ وَتِلْكَ الأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (۲۱) (سورۃ الحشر)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کے عذاب سے بچنے کی تدبیر کرو اور ہر شخص خود دیکھے کہ اس نے کل (آخرت) کے لیے کیا بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔ اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انھیں خود اپنا نفس بھلا دیا یہی لوگ فاسق ہیں۔ اہل جنت اور اہل جہنم برابر نہیں ہو سکتے، جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔ اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا اور پھٹا جا رہا ہے، یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی حالت پر غور کریں۔

سورۃ الحشر کا مختصر تعارف

اس سورہ کا زمانہ نزول ۴ ہجری ہے جس میں مندرجہ ذیل چیزوں پر بحث کی گئی ہے۔

(۱) اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والوں کو بنو نظیر کی جلاوطنی سے عبرت دلانا۔

(۲) منافقین جو یہود کے دوست بن بیٹھے اور ان سے کہتے تھے کہ ہم تمہارا ساتھ آخری دم تک دیں گے ان کو بتانا کہ اللہ اور رسول کے مخالفین کا یہی انجام ہوتا ہے جو بنو نظیر کا ہوا لہٰذا تم اپنے رویے سے باز آجاؤ۔

(۳) یہود کی بزدلی اور ان کی آپسی رقابت کا بیان۔

مندرجہ بالا آیتوں میں خطاب اگرچہ عام مسلمانوں سے ہے لیکن اصل مخاطب منافقین ہیں جو لوگوں سے مخلص مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے جب کہ ان کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ نقض عہد اور رسول کی باتوں سے روگردانی ان کی عادت بن چکی تھی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ .... بِمَا تَعْمَلُونَ

انسان کو اپنی پوری زندگی اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر گزارنی چاہیے۔ اسے ہر لمحہ یہ سوچتے رہنا چاہیے کہ ایک دن آئے گا جب وہ اپنا حساب تن تنہا کھڑے ہو کر اپنے رب کے سامنے دے گا اور اس وقت اس کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ہر شخص کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نے اپنی آخرت کے لیے کیا سامان تیار کر رکھا ہے جو دائمی اور ہمیشہ رہنے والی ہوگی۔ ہر نفس اپنی موت کو یاد کرے جو کبھی بھی آسکتی ہے کیونکہ اس کے بعد اسے عمل کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔

اس آیت میں روز قیامت کے لیے ''غد'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں ''کل'' (tomorrow) (۱) جس طرح سے ''کل'' کا آنا یقینی ہے اسی طرح سے قیامت ضرور آئے گی۔ (۲) دوسرا مطلب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی قریب ہے لہٰذا سستی اور کاہلی سے کام نہ لو بلکہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہو اور آخرت کی تیاری کی پوری کوشش کرو۔ اس

آیت میں دو مرتبہ اتقوااللہ استعمال کیا گیا ہے جن کے الگ الگ مفہوم ہو سکتے ہیں۔ صاحب معارف القرآن نے ۴ مفہوم بیان کیے ہیں جن میں سے دو مندرجہ ذیل ہیں:

"ممکن ہے کہ پہلے اتقوااللہ سے اعمال و احکام خداوندی کی تعمیل کر کے آخرت کے لیے کچھ سامان بھیجنے کا حکم ہو اور دوسرے اتقوااللہ سے اس طرف ہدایت ہو کہ دیکھو جو سامان وہاں بھیجتے ہو دیکھ لو کہ وہ کوئی کھوٹا خراب سامان نہ ہو جو وہاں کسی کام نہیں آئے گا بلکہ ایسا سامان باطل کر دیا جائے گا۔"
(معارف القرآن، مولانا مفتی شفیعؒ ص ۳۹۳، جلد ۱)

وَلَا تَكُونُوا .... الْفَاسِقُونَ

اس آیت میں اس بات پر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ یہود کو اللہ نے ایک مقصد دیا تھا۔ ان کے پاس کتاب تھی۔ ان پر بے شمار احسانات کیے تھے ان سب کے باوجود انھوں نے اللہ کے احکام کی نافرمانی کی، آیتوں میں تحریف شروع کر دی، انبیاء کی باتوں کو ماننے سے انکار کر دیا، جس کے نتیجے میں اللہ نے ان کو ان کے انجام سے غافل کر دیا۔ انھوں نے خدا کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنے آپ کو ہی بربادی کے راستے پر ڈالا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ کی تعلیمات کو بھلا دیتے ہیں اور اپنے معاملات خدائی احکام کے مطابق حل نہیں کرتے تو ان کا انجام بھی وہی ہوتا ہے جو یہود کا ہوا۔ ایسے لوگوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی رنگینیوں میں محو ہوتے ہیں، جب ان کے پاس موت کا فرشتہ آتا ہے تو افسوس کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ جو انسان خدا کو بھولے گا تو وہ اپنے مقصد وجود کو بھول جائے گا اور اسے اپنے نفع و نقصان کی خبر نہ ہوگی۔

اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

"صحیح راستے پر انسان کے ثابت قدم رہنے کا پورا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے خدا یاد رہے، اس سے غافل ہوتے ہی وہ اپنے آپ سے غافل ہو جائے گا اور ایسی چیز اسے فاسق بنا دے گی۔" (تفہیم القرآن، ص ۴۱۱، جلد ۵)

لَا يَسْتَوِي .... هُمُ الْفَائِزُونَ

اہل جنت اور اہل جہنم کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ ایک نے اللہ کی فرمانبرداری کی، اس کے مطابق زندگی گزاری جب کہ دوسرا گروہ اس کے برعکس تھا، اپنے انجام سے غافل رہا، آخرت کی کچھ تیاری نہیں کی۔ دراصل کامیابی تو پہلے گروپ کے لیے ہے جہاں وہ عیش و عشرت کی زندگی گزاریں گے، انھیں طرح طرح کی چیزوں سے نوازا جائے گا جب کہ اہل جہنم کا انجام تکلیف اور پریشانی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ یہ سب صرف اس وجہ سے ہوگا کہ انھوں نے اللہ کو بھلا دیا اور اپنے نفس کے غلام بنے رہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے آپ کو صحیح راستے پر لانے کی ضرور کوشش کرنی چاہیے ایسا نہ ہو کہ تمہارا بھی انجام برا ہو۔

لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ .... لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

اس آیت میں قرآن کی عظمت و بلندی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے کہ پہاڑ جیسی سخت چیز بھی خشیت الٰہی کی وجہ سے ریزہ ریزہ ہو جاتی لیکن تمہارے دل اتنے سخت ہو گئے ہیں کہ تم پر اس کی تعلیمات کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑتا!!!! اگر اپنی زندگی قرآن کے بتائے ہوئے طریقے پر نہیں گزارو گے تو تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ قرآن کی عظمت کا آپ اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب موسیٰؑ نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش کی تو اللہ نے فرمایا تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، ہاں ذرا سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو مجھے دیکھ سکو گے چنانچہ جب اللہ نے پہاڑ پر اپنی تجلی ظاہر کی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَن تَرَانِي وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا
(الاعراف: ۱۴۳)

لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ۔

اس آیت سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ اگر قرآن پہاڑ پر نازل کیا جاتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ دونوں آیتوں پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو طاقت تجلیات ربانی میں ہے وہی طاقت قرآن کے اندر بھی ہے کیونکہ ایک طرف تجلیات سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا تو دوسری طرف وہ خدا کے خوف کی وجہ سے بھی ہو جاتا۔

●●●

درسِ حدیث

اسامہ احسن صدیقی

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کوچۂ یار تو سر مانگ رہا ہے یارو!

عن عبد اللہ بن مسعود قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: " إنَّ الإسلامَ بَدَأَ غَرِیباً وَسَیَعُودُ غَرِیباً کَمَا بَدَأَ، فَطُوبیٰ لِلْغُرَبَاءِ"

ترجمہ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا، عنقریب پھر اجنبی بن جائے گا، لہٰذا ایسے وقت میں اس پر قائم رہنے والے اجنبیوں کے لیے خوشخبری ومبارک بادی ہے (ترمذی)

غریب کا لفظ سنتے ہی ذہن میں کسی کمزور، نادار اور فقیر کا چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ مگر یہ جو ہم سمجھتے ہیں یہ اردو زبان میں غریب لفظ کے معانی ہیں۔ عربی زبان میں غریب کے معنیٰ ہیں اجنبی یا وہ جس سے لوگ نامانوس ہوں اور یہی لفظ جب دعوتِ دین کے بارے میں آتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے، وہ شخص جو اسلام کی دعوت کو اس وقت لے کر اٹھے جب کہ اسلام کی حالت لوگوں میں ایسی ہوگئی ہو کہ لوگ اس کی حقیقت سے ناآشنا ہوں، اس سے نامانوس ہوں اور جب وہ دعوت ان کے سامنے پیش کی جائے تو وہ دعوت اور پکار انہیں اجنبی معلوم ہو، یہی حالت تھی جب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت دنیا کے سامنے پیش کی جیسا کہ خود آپؐ کے مبارک ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ''بَدَأَ الاسلامُ غَرِیباً'' ''اسلام کی ابتدا اجنبیت کی حالت میں ہوئی تھی''۔ یہ اجنبیت کی حالت کیوں کر ہوئی تھی اس کو سمجھنے کے لیے حضرت جعفرؓ کی اُس تقریر کو ملاحظہ فرمائیں جو انھوں نے نجاشی کے دربار میں اس وقت کی جب کہ کفار قریش اُن کو اور ان کے ساتھیوں کو اسلام کی اس اجنبی دعوت پر لبیک کہنے کی پاداش میں بادشاہ سے حاصل کر کے اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنانا چاہتے تھے۔

بادشاہ! یہ کیسا مذہب ہے جس کی خاطر تم اپنے مذہب سے برگشتہ ہو گئے ہو، پھر نہ تم لوگوں نے میرے مذہب کی پیروی کی اور نہ رائج الوقت ادیانِ عالم میں سے کسی اور کی؟

حضرت جعفرؓ کھڑے ہوتے ہیں اور خطیبانہ لہجے میں فرماتے ہیں:

''اے بادشاہ! ہم جاہل و ناداں تھے، بتوں کو پوجتے اور مردار کھاتے تھے، بے حیائیاں ہمارا شیوہ تھیں اور قرابتوں کو توڑنا ہمارا مشغلہ تھا، ہم پڑوسیوں کے ساتھ ظلم و بدسلوکی کرتے تھے، ہم میں جو طاقتور ہوتا کمزوروں کو ہڑپ کر جاتا، زندگی کی ہماری یہی خو تھی، کہ اللہ تعالیٰ نے ہم ہی میں سے ایک شخص کو پیغمبر بنا کر بھیجا جس کے حسب ونسب، سچائی و امانتداری اور پاکدامنی وعفت سے ہم بخوبی واقف تھے، اس نے ہم کو اللہ کی طرف بلایا، کہ ہم اس کو ایک مانیں، اس کی عبادت کریں، ہمارے باپ دادا جن بتوں اور پتھروں کی پوجا کرتے تھے، ان سے یکسر علاحدگی اختیار کرلیں، اس نے ہم کو سچ بولنے، امانت کا حق ادا کرنے، صلہ رحمی کرنے، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے، حرام باتوں سے پرہیز کرنے اور ناحق خون بہانے سے باز رہنے کا حکم دیا، پاکباز عورتوں پر تہمت لگانے سے روک دیا، اس نے ہمیں حکم دیا کہ صرف ایک

خدا کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں ، نماز پڑھیں، زکوۃ دیں اور روزہ رکھیں، تو ہم نے اس کی باتوں کو سچ مانا، ہم اس پر ایمان لائے، اور جو کچھ بھی وہ خدا کی طرف سے لے کر آیا ہے اس کی پیروی کی ، ہم نے صرف خدائے واحد کی بندگی کا دم بھرا، ہم اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک کرنے سے سخت انکاری ہیں ، جن چیزوں کو اس نے ہمارے لیے حرام قرار دیا ان کو حرام جانا، جن چیزوں کو اس نے حلال بتایا ہم نے ان کو حلال جانا، تو اتنی سی بات پر ہماری قوم کے لوگ ہم پر چڑھ آئے۔

یہ ایک جھلک ہے جو اُن حالات میں اسلام کے اجنبی ہونے کے اسباب پر روشنی ڈالتی ہے۔ اسلام کی آمد سے پہلے دنیا کس طرح تاریک تھی ، ظلم و عدوان کا کیسا دور دورہ تھا، جاہلیت فضا پر کس قدر چھائی ہوئی تھی اس کو سمجھنے میں ہم مذکورہ بالا تقریر سے مدد لے سکتے ہیں ، نیز اسلام کی دعوت کیا تھی یہ بھی اس تقریر سے واضح ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے پُر آشوب دور میں جب کہ لوگ نہ صرف جاہلیت میں مبتلا ہوں بلکہ اسی پر اُن کو ناز ہو یہ انقلابی دعوت لے کر اٹھنا اور دنیا کو اس کی طرف دعوت دینا کوئی آسان کام نہ تھا ، کیوں کہ اس دعوت سے جاہلیت کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔ اقتدار پر قابض اور اثر و رسوخ رکھنے والے لوگوں کی چودھراہٹ کو خطرہ تھا، معبودانِ باطلہ کا کھوٹ ثابت ہو رہا تھا، صدیوں سے چلے آرہے آباء واجداد کی تقلید جامد پر ضربیں لگ رہی تھیں، انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے خدائے واحد کی غلامی کی طرف لایا جارہا تھا۔ باطل افکار و نظریات کی تردید ہو رہی تھی، توہم پرستی کا زور ٹوٹ رہا تھا، تو کیوں نہ ہوتا کہ لوگ جو صدیوں سے انہی برائیوں میں ملوث تھے اس دعوت کو اجنبی سمجھتے، اور اس اجنبی دعوت کو دبانے کی کوشش نہ کرتے ، چنانچہ وہی ہوا کہ اس اجنبی دعوت کو لے کر اٹھنے والے خود اجنبی بن گئے، اپنے بیگانے ہو گئے، لوگوں نے رشتے ناطے توڑ لیے، گھروں سے نکال دیا گیا، مگر اسلام نے اُن بزرگ ہستیوں پر جنھوں نے اجنبیت کے اس پرچم کو برابر تھامے رکھا یہاں تک کہ دلوں میں پیغام سجود یاد آگیا اور وہ جبینیں جو خاک حرم سے نامانوس ہو چکی تھیں ، آشنا ہو گئیں لیکن مخبر صادق جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق اسلام دوبارہ اپنی اجنبیت کی طرف لوٹ جائے گا۔ گویا وہی تاریکی اور قدیم جاہلیت جو صدیوں پہلے فضا پر چھائی ہوئی تھی دوبارہ اپنے پیر پھیلانے لگی ، پھر دنیا ظلم وستم کا تاریک کنواں بنے گی، پھر آدمی آدمی پر دست درازی کرے گا، پھر سے کمزوروں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے جائیں گے، پھر سے قرابتوں کو توڑنا شیوہ ہو جائے گا اور پڑوسیوں کے ساتھ بدسلوکی کی جائے گی، پھر دنیا کفر و شرک کی گندگی سے آلودہ ہو گی، غرض کہ دوبارہ بالکل وہی حالات پیدا ہوں گے جس میں اسلام ہر طرح سے اجنبی ہو جائے گا اور اسلام کو ماننے والے نامانوس ہو جائیں گے، دنیا انھیں حیرت کی نگاہوں سے دیکھے گی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ وقت کب آئے گا؟ اس سلسلے میں قرآن و حدیث کے مطالعے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت آئے گا اور ہم اسی دور میں جی رہے ہیں ۔ جی ہاں! یہی وہ دور ہے۔ اب ذرا اسلام کی اجنبیت کی حالت کا ملاحظہ کریں پھر موجودہ دور سے موازنہ کرکے دیکھیں..... چنانچہ جب ہم سابقہ اجنبیت کی حالت کو سامنے رکھتے ہیں اور موجودہ دور میں اسلام کی اجنبیت حالت کو دیکھتے ہیں تو اجنبیت میں بالکل یکسانیت دکھائی دیتی ہے۔ زمانۂ قدیم میں جب انسان انسانوں کو غلام بناتا تھا تو لوگ جنگوں میں جس قوم پر فتح یاب ہوتے تھے ان کے تمام مردوں اور عورتوں کو غلام بنا لیتے اور اپنے یہاں لاکر ان کے ساتھ بدترین سلوک کرتے ، طاقتور قبیلہ کمزور قبیلہ پر اپنے احکام و فرامین جاری کرتا، موجودہ دور میں بھی یہ چیزیں جاری ہیں بلکہ قدیم زمانے سے زیادہ زور و شور کے ساتھ جاری ہیں بس طریقۂ کار میں تبدیلی آگئی ہے ۔ آج جو قوم یا ملک طاقتور اور یا سپر پاور ہوتا ہے وہ نہ صرف ایک قوم کو بلکہ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کو بیک وقت غلام بنانے کی کوشش میں ہوتا ہے ۔ بس اسے قانونی شکل دے دی جاتی ہے ۔ پہلے لوگوں کو جسمانی غلامی میں جکڑا جاتا تھا جس میں ذہن و فکر آزاد ہوتے تھے ، آج جسمانی غلامی کے بجائے ذہنی و فکری غلامی میں جکڑ جاتا ہے، جس سے اُن کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے، بلکہ کمزور قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے، کتنے ہی ممالک اور شہر ایسے ہیں جن کی نسلوں کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور جو ممالک مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے انھیں اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ مکمل طور سے اپنے آپ کو حوالے کر دیں، اس طرح ضمیر کی آزادی کو پامال کیا جاتا ہے، مفتوح قوم پر وہی قوانین اور جاری ہوتے ہیں جو فاتح قوم کی طرف سے ان کے لیے بنائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے تعلیمی ، معاشی، سماجی، سیاسی تمام

میدانوں میں وہ مجبوراً انھیں کے قوانین کو مانتے ہیں اس طرح ایک قوم کے تہذیبی وتمدنی اقدار کا خاتمہ کرکے اور اپنے اصولوں کا پابند بنا کر اس کی اصلیت کا نام ونشان مٹا دیا جاتا ہے۔یہی معاملہ بتوں کے سامنے سر جھکانے کا ہے، قدیم زمانے میں ہر قبیلے کا ایک بت ہوتا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے اور جس کے سامنے سر کو جھکاتے تھے۔جس کی قربان گاہوں پر انسانی جانوروں کا نذرانہ پیش کرتے تھے،لیکن آج ان بتوں کے علاوہ بھی بے شمار ایسے بت ہیں جن کے سامنے انسان مکمل طور سے اپنا سر تسلیم خم کر دیتا ہے،ان کی قربان گاہوں پر لاکھوں انسانی جانوں کو قربان کیا جاتا ہے، گرچہ یہ قدیم زمانے میں بھی موجود تھے مگر دور جدید سے کم طاقتور تھے،اور محدود پیمانوں پر تھے جن میں سے چند یہ ہیں،قوم پرستی،وطن پرستی، نسل پرستی،لونی ولسانی بت،آباء واجداد کی اندھی تقلید وغیرہ۔

قدیم زمانے میں لوگ اپنی جہالت کی بنا پر بغیر کسی دلیل کے ان میں مبتلا تھے مگر دور جدید میں ان بتوں کی پرستش کے لیے دلائل فراہم کئے گئے،اس کے بعد وہ تمام چیزیں ان دلائل کی روشنی میں روا اور جائز کی گئیں جو دو چار انسان جانوں کو نہیں بلکہ پوری پوری قوم کو ان قربان گاہوں پر قربان کر دینے کے لیے ہوسکتی تھیں۔ اس طرح کے بت ماضی کے بتوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہو گئے ہیں اور ظلم وناانصافی کا نار کنے والا ایک سیلاب ابل پڑا ہے۔پھر پڑوسیوں (چاہے وہ چھوٹے پیمانوں پر گاؤں اور قصبے کے لحاظ سے ہوں یا بڑے پیمانوں پر ملکی و وطنی ہوں) کے ساتھ دلائل کی روشنی میں جاری ہوئی،قرابتوں کو پامال کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہوا کہ وہ اپنے مفاد میں آڑے آرہے ہوں، یہ ہیں وہ طاقتور بت جو دنیا کو جہنم کدہ بنانے میں اپنا رول ادا کررہے ہیں۔

قدیم زمانے میں لوگ مردار کھاتے تھے آج زندوں کو ہی ہضم کیا جارہا ہے،تہمت لگانے والے دوسرے ہوتے تھے آج خود انسان سے اپنے اوپر تہمت لگوائی جارہی ہے،جھوٹ ہر طرف عام ہے بلکہ حکومتی سطح پر جاری ہے،حرام وحلال کی تمیز ختم ہے۔امانت داری،صلہ رحمی خود اسلام کے نام لیواؤں میں نہیں۔یہ ہیں وہ حالات جس کی پیشن گوئی رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں کی تھی ”وَ سَیعُودُ کَمَا بَدَأَ“ کہ پھر اسلام اجنبیت کی حالت میں لوٹ جائے گا۔لیکن اب چونکہ آپ خود موجود نہیں اس لیے اجنبیت کے اس دور میں فرض کی پکار پر لبیک کہنا اور اس کے تقاضوں کو سمجھنا ہماری ذمہ داری ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اسلام کے پرچم کو اجنبیت کے اس دور میں سر دھڑ کی بازی لگا کر اونچا کریں، پھر سے حق وصداقت کی آواز بلند کریں، عدل و انصاف کے پودے لگائیں،ظلم وجبر کی تاریک چادر کو چاک کریں،انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرائیں،توحید کا کلمہ بلند کریں،ہر طرح کی غلامی کو ترک کرکے اللہ کی کبریائی کا اعلان کریں، لیکن ظاہر ہے کہ ہوا کے مخالف سمت میں کھڑے ہونا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔مخالف فضا میں اجنبیت کے پرچم کو بلند کرنا آسان نہیں، یہ کام صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو خود کو ساری دنیا میں اجنبی بنانے کے لیے تیار رہو،جس کو اپنے عقیدے اور نظریے پر پختہ یقین ہو،عزم محکم ہو، صبر وثبات اور ثابت قدمی ہو،اس کے ساتھ جرات وہمت ہو،اللہ پر توکل ہو اس کے وعدوں پر کامل یقین ہو، جو اپنی جان و مال اور تمام چیزوں کا اپنے رب سے سودا کرچکا ہو،جس کی سب سے قیمتی متاع رب کی رضا ہو اور اس کو حاصل کرنے والے اسباب وذرائع سے واقف ہو۔ ان تمام چیزوں کو اپنا کر ہی ایک شخص اجنبیت کے پرچم کو اٹھا سکتا ہے اور یہ ذمہ داری چونکہ بہت بڑی ہے اور بالکل انبیائی کام ہے اس لیے اس کام کا بیڑا اٹھانے والوں کو بشارت دی گئی ہے۔”فطوبیٰ للغُرباءِ“ کہا گیا یعنی کہ اسلام کی اجنبیت کی حالت میں اس کے پرچم کو بلند کرنے والوں کے لیے بشارت اور خوشخبری ہے،رب کی رضا کی، اس کی جنت کی ، اس کے دیدار کی ، گناہوں کے بخشش کی ،جہنم سے نجات پانے کی، غرض ہر طرح کی فلاح وکامرانی کی اور حقیقت میں یہی وہ لوگ جو مومن ہیں،ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں،فرض کی پکار پر لبیک کہنے والے ہیں یہی اس اجنبیت کے دور کے ”غرباء“ ہیں جو اپنی جان ومال کا سودا اپنے رب سے جنت کے بدلے میں کرچکے ہیں۔اللہ تعالیٰ اسلام کی اجنبیت کے اس دور میں ہمیں حقیقی اجنبی بننے اور اجنبیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق دے۔آمین

وفا کے ایوان مرمری پر جلی قلم سے لکھا ہوا ہے
یہاں وہی سرفراز ہوگا جو سر کی بازی بھی ہار آئے

●●●

افغانستان عالمی طاقتوں کا قبرستان

ڈاکٹر محمد مبشر خاں

تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی وقت کی کسی نام نہاد سپر پاور کی شامت آتی ہے تو وہ افغانستان پر حملہ آور ہو جاتی ہے۔ انیسویں صدی کی سپر پاور برطانیہ، جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، افغانستان میں اس درجہ رسوا ہوئی کہ اس کا صرف ایک فوجی ڈاکٹر برائڈن زندہ سلامت بچ نکلنے میں کامیاب ہوا جس نے برطانوی فوج کی افغانوں کے ہاتھوں بننے والی درگت کی کہانی اپنے ہم وطنوں کو سنائی۔ بیسویں صدی کی سپر پاور روس بھی برطانیہ کی طرح عبرتناک انجام سے دوچار ہوا اور کمیونسٹ نظام سمیت سوویت یونین کا استعماری ڈھانچہ شکست و ریخت کا شکار ہوا جس کے بطن سے درجن بھر ممالک کو آزادی کی نعمت نصیب ہوئی۔ اکیسویں صدی کی واحد superpower امریکہ کے حالات سے بھی آپ واقف ہیں کہ طاقت کے نشے میں مست ہو کر افغانستان میں داخل ہوا تھا لیکن اب رات کے اندھیرے میں وہاں سے نکلنے کو مجبور ہے۔

جس طرح افغانستان تاریخ کے ہر دور میں برصغیر پر حملہ آور ہونے والی اقوام اور افواج کے لیے دروازے کا کام دیتا رہا، اسی طرح یہ بھی دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ افغانستان تاریخ کے مختلف ادوار میں عالمی طاقتوں کی کشمکش کا مرکز بھی رہا ہے۔ پڑوس کی مختلف طاقتیں اس پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے میں ہمیشہ سرگرم رہی ہیں۔ یہ مختلف اقوام کے درمیان کبھی وجہ نزاع اور کبھی بفر سٹیٹ کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں ہندوستان کے مغلوں اور ایران کے صفویوں کے مابین اس علاقے پر اپنا تسلط جمانے کی سرد جنگ جاری رہی۔

برطانیہ کا سورج غروب ہو گیا

برطانیہ نے افغانستان کے خلاف تین جنگیں لڑیں۔ یکم اکتوبر ۱۸۳۹ء کو وائسرائے ہند لارڈ آک لینڈ نے شملہ میں افغانستان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ انگریزیوں نے سکھوں کی مدد سے شاہ شجاع کو افغانستان کے تخت پر براجمان کرانے کے لیے افغانستان پر چڑھائی کر دی۔ دوست محمد خان نے مقابلہ کرنے کے بجائے ہتھیار ڈال دیے۔ دوست محمد خان نے تو وقتی طور پر ہتھیار ڈال دیے اور افغان عوام نے بھی وقتی طور پر چپ سادھ لی لیکن جونہی انھیں سنبھلنے کا موقع ملا، انھوں نے قابض برطانوی افواج کے خلاف چھاپہ مار کاروائیاں شروع کر دیں۔ انھوں نے پہاڑوں، جنگلوں، گھاٹیوں اور بازاروں میں گھات لگا کر برطانوی فوجیوں کا شکار شروع کر دیا۔

برطانوی افواج ان پے در پے حملوں سے عاجز آ گئی اور اس نے بہار ۱۸۴۱ء میں واپسی کا پروگرام بنایا لیکن موسم بہار تک پہنچتے پہنچتے ان کی ساڑھے سولہ ہزار فوج میں سے بہت کم تعداد باقی بچی تھی جس نے غیر معمولی حفاظتی انتظامات کے ساتھ افغانستان سے جان بچا کر نکلنے کی کوشش کی لیکن افغانوں نے ان بھاگتے فوجیوں کو بھی ایک ایک کر کے شکار کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ جلال آباد پہنچنے تک ان ساڑھے سولہ ہزار میں سے صرف دو برطانوی فوجی زندہ بچے۔ افغانوں نے ان دو کو زندہ حالت میں واپس برطانوی ہند جانے کی اجازت دی تاکہ وہ اپنے ناعاقبت اندیش حکمرانوں کو اپنی تباہی کی داستان سنا سکیں۔ ان میں سے ایک فوجی راستے میں دم توڑ گیا جب کہ دوسرے نے جس کا نام ڈاکٹر برائیڈن تھا، پشاور پہنچ کر

اپنے کمانڈروں کو اپنی آپ بیتی بلکہ انگریز بیتی سنائی۔

روس ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا

برطانیہ کے وقت سے ہی روس آمو دریا کے پاس کھڑا افغانستان پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ستمبر ۱۹۵۳ء میں شاہ محمود کی جگہ محمد داؤد افغانستان کا Primeminister بنا۔محمد داؤد کے دور میں افغانستان روسی خفیہ ایجنسی کی جی بی کا گڑھ بن گیا تھا۔ کے جی بی افغان معاشرے کے مختلف طبقات مثلاً طلبہ، تاجروں، مزدوروں اور کسانوں میں اپنے حامی تلاش کرنے اور انھیں منظم کرکے افغانستان کو ایک کمیونسٹ ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس عمل میں اسے داؤد حکومت کا مکمل اشیر باد حاصل تھی۔

دریں اثنا افغانستان میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان (پی ڈی پی اے) کے نام سے کمیونسٹ پارٹی کی باقاعدہ تنظیم وتشکیل عمل میں آئی۔ ببرک کارمل، نور محمد ترہ کئی اور حفیظ اللہ امین اس کے نمایاں رہنماؤں میں شامل تھے۔ کمیونسٹ پارٹی نے معاشرہ کی افغان اور اسلامی اقدار کا سرعام مذاق اڑایا اور کمیونزم کی آڑ میں الحاد اور لادینیت کا پرچار کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی کمیونسٹ عناصر نے ہاشم میوندوال کی حکومت کے خلاف مظاہرے، توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ کی کاروائیوں کا بھی آغاز کر دیا۔ کابل یونیورسٹی کے اشتراکیت زدہ طلبہ و اساتذہ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ان مظاہروں کے نتیجہ میں ۱۹۷۳ء میں میوندوال کی چھٹی کرا کر اس کی جگہ کابل یونیورسٹی کے ڈائریکٹر نور محمد اعتمادی کو وزیر اعظم بنوا دیا گیا۔

اسلام پسند طبقہ افغانستان میں

یہی وہ وقت بھی تھا جب اسلام پسند طبقہ افغانستان میں اٹھ کھڑا ہوا۔جب رفتہ رفتہ کمیونسٹ عناصر جارحیت پر اُتر آئے۔وہ مذہب سے مذاق کے ساتھ ساتھ ان طلبہ وطالبات سے بدسلوکی کرتے جو قرآن پڑھتے یا نماز ادا کرتے تھے۔اس صورت حال نے مسلمان طلبہ کے دل میں منظم ہونے کا خیال جگایا۔مگر وہ اس ملحد گروہ کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت کم تھے جس کو ملک کے اندر کمیونسٹوں اور ملک سے باہر ایک سپر پاور کی حمایت حاصل تھی اور خود حکومت وقت جن کی پشت پناہ تھی۔ اس اثناء میں دو ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے اسلام کے مخلص اور شیدائی نوجوانوں کی آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اب الحاد اور دہریت کا مقابلہ بغیر کسی تنظیم کی شکل کے نہیں کیا جاسکتا۔ایک واقعہ قرآن کریم کی بے حرمتی کا پیش آیا جب کچھ گمراہ کمیونسٹوں نے قرآن پاک کو (نعوذ باللہ) پھاڑ کر یونیورسٹی کی ایک تین منزلہ عمارت سے نیچے پھینک دیا۔دوسرا واقعہ اسلام کے خلاف انتہائی دلآزار مواد رکھنے والی فلم کی نمائش کا تھا۔اس فلم نے مسلمانوں کے سینے میں غم وغصہ کی آگ بھڑکا دی۔اس کے علاوہ کچھ مارکسی انتہا پسندوں نے لینن کو حضور نبی کریم ﷺ کی ذات سے مشابہ قرار دینے کی جسارت کی۔

''درود لینن'' کو تحریر وتقریر کے دوران کثرت سے استعمال کیا جانے لگا۔(۱۹۷۰ء میں افغان کمیونسٹ پارٹی (پرچم) کے اخبار میں ایک نظم شائع ہوئی جس میں لینن پر ''درود'' بھیجنے کی ناپاک جسارت کی گئی تھی)۔ان اشتعال انگیز سرگرمیوں کے ردعمل کے طور پر ایک روز سولہ ہم خیال طلبہ یونیورسٹی کی ایک مسجد میں جمع ہوئے۔ اس اجلاس میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ اسلام کی سربلندی کے لیے مشترکہ لائحہ عمل کے مطابق کام کیا جائے گا اور کیمپس میں کمیونزم کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان نوجوانوں نے چراغ سے چراغ روشن کرتے ہوئے بہت جلد یونیورسٹی کے سیکڑوں دوسرے طلبہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ان طلباء نے نے ''نوجوانانِ اسلام'' کے نام سے باقاعدہ تنظیم تشکیل دی جس کے بانی ارکان کی تعداد صرف سولہ تھی۔ اس تحریک نے بہت جلد یونیورسٹی کے دیگر شعبہ جات اور دوسرے تعلیمی ادارہ جات کے طلبہ کے دلوں میں گھر کرلیا۔ریاستی تشدد اور کمیونسٹوں کی غنڈہ گردی کے باعث یہ تنظیم سرعام اپنی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔لہٰذا انھوں نے نہایت احتیاط اور حکمت عملی کے ساتھ اپنی سرگرمیوں کو مربوط کیا۔جب یہ اسلام پسند طلبہ اپنے آپ کو ایک تنظیم کے سانچے میں ڈھال چکے اور ان کی دعوت تعلیمی اداروں میں سرایت کرگئی تو انھوں نے اشتراکی کوچہ گردوں کو سرعام چیلنج کرنا شروع کر دیا۔

عام طور سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ روس نے ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں اپنی فوجیں اتاری اور وہ بھی وہاں کے حکمرانوں کی درخواست پر لیکن ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔ دراصل روس افغانستان میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کے لیے

مختلف طریقے اپنا رہا تھا۔ایک طرف وہ افغانستان کے حکمرانوں کو اپنے مہرے کے طور پر استعمال کر رہا تھا جس میں داود، نور محمد ترہ کئی، حفیظ اللہ امین، اور ببرک کارمل شامل تھے تو دوسری طرف وہ افغانستان میں موجود کمیونسٹ عناصر کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

روسی فوجیں داؤد کے وقت سے ہی افغانستان میں اپنے اہداف کی تکمیل میں مصروف تھیں۔ داؤد نے جب ظاہر شاہ کے خلاف فوجی بغاوت کے ذریعے انقلاب برپا کیا تو اس عمل میں روسی فوج کی عملی اور اسلحہ کی مدد شامل تھی۔ ترہ کئی کا انقلاب تو تھا ہی کمیونسٹ انقلاب، اس لیے اسے "انقلاب ثور" (سرخ انقلاب) کہا جاتا ہے۔نور محمد تارہ کئی کے بعد افغانستان کا اقتدار دوسرے کمیونسٹ رہنما اور روس کے کٹھ پتلی حفیظ اللہ امین کے ہاتھوں میں آگیا۔ان ہی کی حکومت میں روس نے اپنی فوجیں افغانستان میں اتار دی اور افغانستان پر براہ راست حملہ کر دیا۔اور اپنے وفادار حفیظ اللہ امین اور اس کے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔روس کے افغانستان پر براہ راست حملہ کے بعد سے ہی وہاں کی تحریک اسلامی نے مسلح بغاوت شروع کر دی۔اس وقت وہاں پر دو مرکزی قائدین اور ان کی دو مرکزی جماعتیں موجود تھیں۔ ایک جمعیت اسلامی جس کے قائد پروفیسر برہان الدین ربانی اور دوسری حزب اسلامی انجینیر حکمت یار کی قیادت میں روسیوں کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی تنظیمیں تھیں جن میں گرچہ کچھ اختلافات تھے لیکن جب روسی جارحیت کے خلاف معرکہ کارزار گرم ہوا تو ان تنظیموں کو اپنی اپنی تنظیمی ترجیحات اور اختلافات کے باوجود مل کر دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا اور ان کے باہمی اختلاف وقتی طور پر دب گئے۔

روسی حملے کے دو ہفتے کے اندر اندر مجاہدین نے ملک کے کونے کونے میں روسی قابض فوجوں کے خلاف موثر کاروائیوں کے ذریعے دشمن کے ہوش اڑا دیے۔افغان مجاہدین کی جنگ گوریلہ طرز کی تھی جس میں مجاہدین اچانک حملے کے ذریعے دشمن کو ضرب لگا کر رفو چکر ہو جاتے۔گوریلہ کاروائیوں میں تو انھیں قابض روسی فوج پر برتری حاصل تھی ہی اس کے علاوہ ان کے پاس ٹینک شکن میزائل، راکٹ لانچر اور دوسرا اسلحہ بھی موجود تھا جو وہ بڑی مہارت سے دشمن کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔اس جنگ میں ایک نیا موڑ تب آیا جب مجاہدین کو امریکہ نے اسٹنگر میزائل فراہم کر دیا۔ مجاہدین کو اسٹنگر میزائل کے استعمال سے پہلے بھی زمینی کاروائیوں میں اپنے دشمن پر برتری حاصل تھی لیکن اب جب کہ مجاہدین نے روسی بمبار طیاروں اور گن شپ ہیلی کاپٹروں کا چڑیوں کی طرح شکار شروع کر دیا تو روس کی فضائی برتری بھی ختم ہو کر رہ گئی۔بحر و بر، ہواؤں، فضاؤں اور خلاؤں کی تسخیر کے دعویدار روسی اب بقول اُن کے، ان پڑھ، گنوار، جدیدیت سے نا آشنا افغان مجاہدین کے ہاتھوں بُری طرح نشانہ بن رہے تھے۔

آخر کار وہی ہوا جو ہونا تھا۔روس افغانستان میں شکست کھا گیا۔نتیجتہً وہاں کی کٹ پتلی حکومت اور روس کے درمیان جنیوا معاہدہ ہوا۔جس کی آڑ میں ۱۵ مئی ۱۹۸۸ء کو ۱۲۰۰۰ فوجیوں پر مشتمل اُس کا پہلا دستہ افغانستان سے واپسی کے لیے روانہ ہوا اور ۱۵ فروری ۱۹۸۹ء کو اس کا آخری دستہ بھی دریائے آمو عبور کر گیا۔آخری شخص جس نے شکست کے احساس سے بوجھل دل کے ساتھ دریائے آمو عبور کیا، افغانستان میں تعینات روسی فوج کا کمانڈر جنرل گراموف تھا۔کہا جاتا ہے کہ جنرل گراموف نے آمو پُل سے گزرتے ہوئے دریا میں کود کر خودکشی کی کوششیں بھی کی جو اُس کے ساتھیوں نے ناکام بنا دی۔تجزیہ نگاروں نے اُسے ڈوبنے والے جہاز کا زندہ بچ جانے والا کپتان قرار دیا۔

عام طور سے یہ بات مشہور کی گئی کہ افغان مجاہدین کو امریکہ نے مدد فراہم کی۔اور انکی فراہم کردہ اسٹنگر میزائیل کی وجہ سے ان کو جیت ملی لیکن یہ ایک طرح کا جھوٹ ہے جو پھلایا جا رہا ہے۔اس جنگ میں امریکہ بہت بعد میں شامل ہوا اور اسٹنگر میزائیل بھی اس نے مجبوری کی حالت میں دی۔ہوا یوں کہ مجاہدین نے اپنی روایتی ہتھیاروں سے افغان فضائیہ کا طیارہ مار گرایا۔روس کی طرف سے الزام لگایا گیا کہ یہ طیارہ امریکی اسٹنگر میزائل سے گرایا گیا ہے حالانکہ اس وقت اسٹنگر میزائل مجاہدین کو فراہم نہیں کیے گئے تھے۔اس مجبوری میں امریکہ نے ان کو اسٹنگر میزائیل دینا مناسب سمجھا۔اور اگر مان لیا جائے کہ امریکہ کی مدد سے افغان مجاہدین جیتے تو سوال بنتا ہے کہ اب امریکہ اپنی پورے لاؤ لشکر کے ساتھ کیوں ہار گیا؟ دس سال روس قابض رہا۔پندرہ لاکھ افغانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ دس لاکھ جسمانی طور پر معذور ہو گئے۔ایک کروڑ اسی لاکھ کی آبادی میں ساٹھ لاکھ روسی مظالم سے بچنے کے لیے ہجرت کر گئے۔

طالبان کا ظہور

روس کے انخلا کے وقت وہاں کوئی عبوری حکومت نہ بننے کے نتیجے میں افغانستان خانہ جنگی کا شکار ہوگیا۔ کبھی مجاہدین اور کمیونسٹ افغان فوج اور انتظامیہ کے درمیان، کبھی کمیونسٹ جرنیلوں کے ملیشیاؤں کے مابین، کبھی مجاہدین کے مختلف گروپ کمیونسٹ کے ایماء پر باہم دست و گریباں ہوئے۔ وہ مجاہدین جو اب تک اپنے اختلافات کو بھلا کر متحد ہو کر روس کے خلاف لڑ رہے تھے لیکن اب بدلے ہوئے حالات میں پشتون تا جک عصبیت جاگ اٹھی اور نظریاتی دوست اب دشمن ٹھہرے۔ گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود ایک دوسرے کے لیے ناقابل قبول تھے۔ امریکہ اور کمیونسٹ جرنیلوں کی ترجیح اول بھی یہی تھی کہ مجاہدین کی صفوں میں نسلی تعصبات ابھار کر انھیں باہم دیگر برسر پیکار کر دیا جائے۔ افغان جہاد کے یہ دونوں ہیرو روس کو زیر کرنے کے بعد دشمن کی ان سازشوں کا بڑی آسانی سے شکار بن رہے تھے۔

مختلف افغان گروہوں کے درمیان خانہ جنگی جاری تھی کہ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں قندھار کے افق سے طالبان نمودار ہوئے۔ یہ افغان مہاجرین کے وہ بچے تھے جو پاکستان میں قیام کے دوران مختلف دینی مدارس میں زیر تعلیم رہے۔ یہ "پُر اسرار بندے" کس کی تخلیق تھے اور کس نے انھیں منظم کیا تھا، یہ ایک الگ موضوع بحث ہے۔ اور مختلف لوگ مختلف باتیں بیان کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ طالبان کے نام پر جن افراد نے قندھار سے کابل تک اور پھر مزار شریف تک پیش قدمی کی اور آندھی اور طوفان کی طرح افغانستان کے افق پر پھیل گئے حتیٰ کہ وہ مجاہد کمانڈر، جنھوں نے روس جیسی سپر پاور کو شکست دے کر پارہ پارہ کر دیا تھا، اُس ابھرتی ہوئی قوت کے مقابل نہ ٹھہر سکے اور بعض بغیر مزاحمت کے جب کہ بعض معمولی مزاحمت کے بعد پسپائی پر مجبور ہو گئے۔ انھوں نے بتدریج پیش قدمی کرتے ہوئے جہادی رہنماؤں اور کمانڈروں کو غیر موثر کر دیا اور کسی قابل ذکر مزاحمت کے بغیر ملک پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

افغانستان میں نئی قبر

طالبان نے جہاں ایک طرف آپسی خانہ جنگی کو ختم کیا تو دوسری طرف ایسی اصلاحات بھی کیں کہ لوگوں کا ان پر اعتماد بڑھتا چلا گیا۔ لیکن یہ سب دنیا کے ظالم اور جابر لوگوں کو کہاں راس آنے والے تھا۔ اس لیے جب 9/11 کا واقعہ ہوا تو اس کی بنیاد پر امریکہ بہادر کو ان پر حملہ کرنے کا جواز پیدا ہو گیا۔ امریکہ نے اس کا الزام اسامہ بن لادن پر رکھا جو اس وقت افغانستان میں موجود تھا۔ امریکہ نے طالبان حکومت سے بن لادن کو ان کے حوالے کرنے کو کہا۔ ملا عمر نے اپنے مہمان کو امریکہ کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اگر امریکہ کے پاس ان واقعات میں اسامہ کے ملوث ہونے کے شواہد ہیں تو وہ ثبوت پیش کریں تا کہ افغانستان میں اسامہ پر مقدمہ چلایا جاسکے۔ لیکن امریکہ جارحیت پر اتر آیا ہوا تھا۔ اقوام متحدہ سے ایک قرارداد منظور کروا کر نیٹو کی عسکری قوت کے ذریعے افغانستان پر چڑھ دوڑا۔ ۷/ اکتوبر ۲۰۰۱ء پیر کا دن اس وقت دہشت گردی اور ظلم و ستم کا ایک سیاہ باب بن گیا جب نو بج کر چالیس منٹ پر عالمی دہشت گرد امریکہ اور اس کے چیلے برطانیہ نے دنیا کے سب سے کمزور و نادار ملک پر آگ اور بارود کی مسلسل بارش کر کے درجنوں معصوم شہریوں کو خاک و خون میں لت پت کر کے رکھ دیا۔ لیکن امریکہ طاقت کے نشے میں یہ بھول چکا تھا کہ اس نے افغانستان میں قدم رکھا ہے جو عالمی طاقتوں کے قبرستان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا جوش بہت جلد ٹھکانے لگ گیا اور کچھ ہی دن بعد اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ ان کے defence minister کو کہنا پڑا کہ ہم افغانستان پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اور آخر کار امریکہ نے اپنی عزت کو بچاتے ہوئے طالبان کے ساتھ دوحہ معاہدہ کر لیا۔ یہ معاہدہ 12 سال کے طویل ترین بحث ومباحثے کے بعد آخری شکل میں سامنے آیا ہے۔

اس معاہدے کے متن میں ۱۶ مرتبہ ایک ہی جملہ لکھا گیا ہے: "امارت اسلامی افغانستان جس کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک مملکت کے طور پر تسلیم نہیں کرتی اور طالبان کے نام سے جانے جاتے ہیں۔" اس طرح معاہدے میں جارح طاقت کی حیثیت سے امریکہ نے نہ اپنی غلطی تسلیم کی اور نہ افغان قوم سے ان مظالم اور قتل عام پر معافی مانگی، جو گذشتہ ۱۹ سالوں میں امریکی اور اس کی اتحادی افواج کی جارحیت کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ۲۰۲۰ء میں امریکی خصوصی نمائندے زلمے خلیل زاد نے دوحہ میں طالبان کے ساتھ جس معاہدے پر دستخط کیے، تقریباً ۲۲ سال قبل اپریل ۱۹۹۸ء کو امریکہ کے اقوام متحدہ میں سفیر بل رچرڈسن یہی کچھ طالبان رہنما

ملاعمر سے منوا چکے تھے۔ رائے گٹمین کی کتاب "How We Missed the Story: Osama bin Laden, the Taliban, and the Hajacking of Afghanistan" میں درج ہے کہ ''طالبان نے نہ صرف جنگ بندی پر رضامندی ظاہر کی تھی، بلکہ شمالی اتحاد کے ساتھ وہ گفت وشنید کے لیے بھی تیار ہو گئے تھے''۔

اور اب ۱۹ سال کے بعد ڈیڑھ لاکھ افغانوں کی ہلاکت اور کھربوں ڈالر کی بربادی کے بعد بھی وہی نتیجے نکلے تو اس کا فائدہ کیا ہوا۔ دراصل بات یہ ہے کی طاقت کے نشے میں چور عالمی طاقتوں کو عقل بعد میں آتی ہے جب تک وہ انسانوں کا خون اچھی طرح نہیں پی لیتی ہیں۔

ہم کیا چاہتے؟

اس معاہدہ کے بعد اب پوری دنیا کی نظریں افغانستان پر لگی ہوئی ہیں اور سب کے ذہن میں ایک ہی سوال ہے کہ آخر طالبان چاہتے کیا ہیں؟ امریکہ کے مشہور اخبار the New York Times میں شائع نائب امیر طالبان سراج الدین حقانی کا مضمون what we the Taliban Want اس مسئلہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے صاف کیا ہے کہ امریکہ کی زیر قیادت غیر ملکی افواج کے خلاف جنگ، ہمارا انتخاب نہیں تھا بلکہ جب ہم پر یہ جنگ مسلط کر دی گئی تو ہم اپنا دفاع کرنے پر مجبور تھے۔ لہٰذا، غیر ملکی افواج کا انخلا ہمارا اولین اور اہم مطالبہ ہے، اور اسی غیر معمولی مسئلے پر ہم آج امریکہ کے ساتھ امن معاہدے کر رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ غیر ملکی افواج کے انخلا اور مداخلت سے نجات کے بعد، ہم مشترکہ طور پر ایک اسلامی نظام کے لیے راہ ہموار کریں گے، جس میں برابری کی بنیاد پر تمام افغانوں کے حقوق محفوظ ہوں گے، تعلیم اور روزگار سمیت خواتین کے وہ تمام حقوق محفوظ ہوں گے، جو اسلام نے دیے ہیں۔ کہ اگر ہم کسی غیر ملکی دشمن کے ساتھ معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، تو باہمی اختلافات کو افہام وتفہیم سے احسن طریقے سے ختم بھی کر سکتے ہیں۔

انھوں نے تو یہاں تک کہا کہ ہمارے ہم وطن بہت جلد اس تاریخی معاہدے پر عمل درآمد کے بعد تمام غیر ملکی افواج کے انخلا کا مشاہدہ کریں گے۔ جب ہم اس مرحلے کے قریب پہنچ رہے ہیں، تو یہ بھی ممکن ہے کہ بہت جلد ہم اپنے تمام افغان بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ مل کر پائیدار امن اور ایک نئے افغانستان کی بنیاد کی طرف تحریک کا آغاز کریں گے جو دیگر ممالک میں مقیم تمام افغان شہریوں کو اپنے ملک اور گھر کی طرف واپس آنے کی دعوت دے گا، جہاں ہر ایک کو عزت اور امن کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق ہو۔ (What We the Taliban Want?، مطبوعہ دی نیویارک ٹائمز، ۲۰ فروری ۲۰۲۰ء)

اب کون؟

اس معاہدہ پر عمل درآمد کے پابند ہونے کی وجہ سے امریکہ تقریباً اپنی پوری فوج وہاں سے نکال چکا ہے اور اس طرح افغانستان ایک بار پھر عالمی طاقتوں کا قبرستان ثابت ہوا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب کونسی طاقت افغانستان پر حملہ کرنے کی غلطی کرتی ہے۔ اگر کوئی ملک ایسا کرتا ہے تو پھر اس کا بھی وہی حشر ہونے والا ہے جو اس سے پہلے کی طاقتوں کا ہوا ہے۔ وہ کون ہے یہ ابھی سوال بنا ہوا ہے جس کا جواب آنے والا وقت ہی دیگا لیکن اتنا طے ہے کہ وہ اس ملک کی تاریخی غلطی ہوگی۔

●●●

کسی تحریک کی کامیابی کا راز

تحریکیں ایسے لوگوں کے بھروسے کامیاب نہیں ہوتیں جو ان میں اس لیے شامل ہوئے ہوں کہ اس وقت ان کا سورج بلند ہوتے دیکھ رہے ہوں۔ ایسے لوگوں کے سہارے آگے نہیں بڑھتیں جو ان میں اس لیے شامل ہوئے ہوں کہ ماتحتوں پر اپنی قیادت کا سکہ جمائیں اور نہ ایسے لوگوں کے بل پر پھلتی پھولتی ہیں جو ان میں اس لیے شامل ہوئے ہوں کہ ان کے واسطے سے اپنے مفادات و اغراض کی تکمیل کر سکیں اور تحریکوں کی منڈی میں ان کا کاروبار چمکانے کے لئے انہیں خوبصورت جنس بازار بنا کر پیش کریں۔ بلکہ تحریکیں ان جیسے افراد کے سہارے اٹھتی اور آگے بڑھتی ہیں جن کے دل اللہ کی طرف متوجہ اور یکسو ہوتے ہیں اور جو کسی جاہ ومنصب کے طالب یا مال ومتاع اور منفعت کے خواستگار نہیں ہوتے بلکہ صرف اللہ کی خوشنودی چاہتے اور اس کی رضا کی آس لگائے رکھتے ہیں۔

(فی ظلال القرآن)

(مترجم) از سید قطب شہید، ج ۸، سورۃ الکہف

●●●

تحریک اسلامی کا تعارف

احمد اسامہ جعفری

جس وقت اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تخلیق کی، اسی وقت اس کو اجتماعی انداز میں چلانے کا اصول بھی بنا کر دے دیا تھا۔ چنانچہ صرف حضرت آدمؑ کی تخلیق پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ انہیں سے ان کا جوڑا بنا کر ان سے نوعِ انسانی کا پھیلاؤ کیا۔ پھر اس پوری نوعِ انسانی کو ایک ہی قوم اور قبیلہ نہیں بنا دیا بلکہ مختلف قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کر دیا۔ اس بات کو القرآن الکریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس طرح بیان کیا:

''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں'' (النساء:۱)

مزید فرمایا:

''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قومیں بنائیں تاکہ تمہاری آپس میں پہچان ہو'' (الحجرات:۱۳)

گویا دنیا اول روز سے ہی اکیلے اکیلے نہیں چل رہی ہے بلکہ اجتماعیت کے انداز میں چل رہی ہے۔ اسی اجتماعیت کو ایک معاشرہ کی شکل دے دی گئی۔ سب کو ایک دوسرے کے کام آنے پر مجبور رکھا گیا، اسی لئے آپسی تعارف کے لئے ان میں تقسیم کی گئی۔ چونکہ حضرت آدمؑ کو زمین پر بھیجتے وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایات کی اطاعت کا عہد لیا تھا، اسی لئے جب دنیا میں پورا معاشرہ وجود پذیر ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ ہدایات بھیجیں۔ پھر اگر لوگ ایمان لے آئے تو کامیاب ہوئے ورنہ ان کو ایک نشان عبرت بنا کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ آخر میں حضرت محمد ﷺ کو مبعوث کیا گیا جنہوں نے قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے ہدایاتِ الٰہی کو عربوں کے سامنے نہ صرف پیش کیا بلکہ عملاً ان ہدایات کو ایک چلتا پھرتا معاشرہ بنا کر دکھا دیا۔ اپنے ربِ حقیقی کے پاس جاتے جاتے نبی اکرم ﷺ نے یہ ذمہ داری اپنی امت کے سپرد کر دی کہ ان ہدایات کو ان لوگوں تک پہنچا دیں جن تک یہ ہدایات نہیں پہنچیں۔

تحریک اسلامی کیا ہے؟

تمام انبیاء خصوصاً رسول کریم ﷺ کی پوری سیرتِ مطہرہ تحریکِ اسلامی کی اصل اور خالص شکل ہے۔ تمام انبیاء اپنے ادوار میں اس تحریک کے امام رہے ہیں اور اب آخری نبی اور امام الانبیاء ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ اس تحریک کے اصل قائد اور امام ٹھہرے۔ رہبر و رہنما، مصطفیٰ مصطفیٰ۔ آپ ﷺ کے بعد یہ تحریک ایک پورے اجتماعی نظام خلافتِ راشدہ کی شکل میں ۳۰ سال تک قائم رہی۔ اس کے بعد اس میں مستقل زوال شروع ہوا اور بالآخر ۱۹۲۴ء میں اس کا مکمل معاشرتی انتظامی وجود ختم ہوگیا۔ اس دوران میں جیسے جیسے خامیاں ظاہر ہوتی رہیں، ویسے ویسے یہ تحریک اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے کوششوں کو وجود میں لاتی رہی۔ چنانچہ جب رسول ﷺ کی جانب جھوٹی باتیں منسوب کی جانے کا سلسلہ شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو توفیق دی جنہوں نے محدثین کرام اور فقہائے عظام بن کر تحریکِ اسلامی کی خدمت انجام دی۔ سنتِ رسولؐ کے نام پر پھیلے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں سے خالص موتیوں کو چنا اور قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لئے انہیں جمع کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اس وقت کے زوال کے اسباب کو دور کرنے کی کوشش کی۔

اس کے بعد مختلف ضرورتوں کے لئے مختلف

لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے توفیق بخشی اور وہ تحریکِ اسلامی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس تحریک نے اپنے ۱۴۰۰ سالہ سفر میں جن کو اپنے دامن میں لیا ان میں حضراتِ حسنین علیہما السلام، ائمہ اربعہ، امام جعفر صادقؒ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، سلطان صلاح الدین ایوبی، سلطان محمد فاتح، اورنگ زیب عالمگیر، شہید ٹیپو سلطان، مجدد الف الثانی شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید وغیرھم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ یہ کچھ نام ہیں ورنہ اس تحریک کا خادم بننے کا شرف جن شخصیتوں کو حاصل ہوا ان کی فہرست بنانا ایک مستقل کام ہے۔

۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی میں امت مسلمہ تو باقی رہی لیکن اسلام کا بحیثیت دین کسی بھی شعبہ میں کوئی خاطر خواہ غلبہ باقی نہ رہا۔ خصوصاً ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ مسلمانوں کی عالمی مرکزیت کا تو خاتمہ ہوا ہی، ساتھ ہی بحیثیت دین اسلام کا غالب وجود عملی دنیا میں مکمل طور سے ختم ہوگیا۔ چنانچہ اس دور میں جو کوششیں ہوئیں وہ دو انداز کی تھیں۔ ایک طرف مسلمانوں کی خالص قومی اعتبار سے فلاح و بہبود کی کوشش جس کی مشہور مثال علی گڑھ تحریک ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی صرف قومی فلاح و بہبود کی کوششیں ہی ہوئیں نہیں بلکہ ان کی ایمانی و اسلامی فلاح و بہبود کی کوششیں بھی۔ یہی دوسری قسم کی وہ کوششیں ہیں جن کا شمار تحریکِ اسلامی میں ہوتا ہے، کیونکہ ان کا مقصود مسلمانوں کو ایک جھاڑ پھونس کی طرح جمع کرنا نہ تھا بلکہ ان کا مقصود اُس امتِ مسلمہ کو دنیاوی و اخروی فلاح و کامرانی سے ہمکنار کرانا تھا جو حقیقت میں مسلمان کہلانے کی اہل ہو۔ اس سلسلہ میں جو کوششیں ہوئیں وہ اتنی زیادہ اور ایک ہی وقت میں ہوئیں کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا جتنا شکر بھی ادا کیا جائے کم ہے۔ ایک معتبر روایت کے مطابق ہندوستان میں طلبہ تحریک کے اولین دور کے ایک کارکن نے تحریک اسلامی کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ ہر وہ جماعت جس کا مقصود و مطلوب اسلام کی بالادستی ہو، اسے ہم تحریکِ اسلامی کا حصہ سمجھتے تھے۔

جن تحریکی شخصیات کا اب ذکر آرہا ہے، اگرچہ آج ان کا بہت احترام ہوتا ہو لیکن اپنے دور میں ان پر جو کچھ الزام تراشیاں ہوئیں اور جو ذہنی تکلیفیں ان کو خود اس امت کے ذمہ دار طبقے نے دیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ بہرحال، اس دور کی عظیم ترین شخصیت جو اس تحریک نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے پیدا کی وہ علامہ محمد اقبالؒ کی ہے۔ آپ نے نہ صرف دورِ ظلمت میں رسول اللہ ﷺ کی سنت کو زندہ کیا بلکہ دین کے تصور پر جو گرد پڑی تھی اسے فضل ربانی سے صاف کیا اور اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھ ڈالی۔ ان کے علاوہ مختلف علاقوں میں مختلف کوششیں ہوئیں۔ مصر میں امام حسن البنا شہیدؒ نے اخوان المسلمون کے نام سے ۱۹۲۸ میں ایک جماعت کی بنیاد رکھی جس میں سید قطب شہیدؒ، محمد قطب، حسن الہضیبیؒ، زینب الغزالیؒ وغیرھم جیسے نامور خدامِ تحریک پیدا ہوئے۔ اس تحریک کا اثر پوری عرب دنیا اور مغربی دنیا میں ہوا۔ چنانچہ اس کے زیرِ اثر فلسطین میں شیخ احمد یاسینؒ نے حماس قائم کی۔ ترکی میں نجم الدین اربکانؒ نے اسلام کا علم بلند کیا۔ اسی دورانیہ میں عالم شیعیت میں امام خمینیؒ نے ایران میں اسلامی انقلاب کی صدا بلند کی اور ۱۹۷۹ء میں انقلاب بھی برپا کیا۔ عجمی دنیا اور خصوصاً برعظیم ہندوستان میں تقسیم سے قبل اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، شدھی تحریک سے مسلمانوں کے ایمان کو بچانے کے لئے ۱۹۲۶ء میں بنائی گئی تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاسؒ، خلافت تحریک کے بانی مولانا محمد علی جوہرؒ اور اقامتِ دین و حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد کی خاطر ۱۹۴۱ء میں قائم کی گئی جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ وغیرھم اس تحریک کی نمایاں پیداوار تھے۔ ان تمام کوششوں کا مطمحِ نظر اسلام، ایمان اور عقیدہ کی حفاظت اور بالادستی تھی۔ تحریکِ اسلامی کے متعلق ڈاکٹر سید اسعد گیلانیؒ لکھتے ہیں:

''ہر تحریکِ اسلامی انسان کی پوری زندگی میں بندگیٔ رب کے نفاذ کی دعوت لے کر اٹھتی ہے۔ وہ خدائی احکام کے نفاذ و ترویج کی دعوت دیتی ہے چوں کہ احکام کا تعلق انسان کی شخصی اور اجتماعی زندگی کے دونوں پہلوؤں سے ہوتا ہے اس لئے وہ بیک وقت فرد، معاشرے اور حکومت کی اصلاح کے لئے اقدامات کرتی ہے... تحریک اسلامی ایک باطل نظام کے غلبے کی حالت ہی میں نمودار ہوتی ہے تاکہ اس غلبہ کو توڑ سکے۔ اسلامی نظام کی موجودگی میں اقامتِ دین کی کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خود اسلامی حکومت اور اس کے کارپرداز ہی اسلامی تحریک کے کارکنوں کا کام کرتے ہیں۔'' (اسلامی تحریک کی بنیادیں)

علامہ یوسف القرضاوی تحریک اسلامی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تحریکِ اسلامی سے ہماری مراد وہ منظم عوامی اجتماعی سرگرمیاں ہیں جو پورے معاشرے اور پوری زندگی کو اسلام کے زیر سایہ لانے کے لئے کی جائیں۔

یعنی کہ تحریک اسلامی صرف باتوں، تقریروں، لکچروں، کتابوں یا مقالوں کا نام نہیں ہے۔ اگرچہ یہ تمام چیزیں بھی مطلوب ہیں اور تحریک کا ایک جزو ہیں مگر مکمل تحریک نہیں ہیں۔ تحریک نام ہے کام کا.....انتھک اور مسلسل محنت اور کوشش کا۔

(تحریکِ اسلامی، طریق و ترجیحات۔ مترجم عبدالغفار عزیز، ص 11)

اس تحریک کا اہم ترین وصف یہ ہے کہ یہ اپنی جدوجہد کی بنیاد ایمان و تقویٰ پر رکھتی ہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے تعلق باللہ کو اپنے کارکنان میں اولاً پیدا کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ اس کی ڈگر صرف پھولوں سے سجی نہیں بلکہ کانٹوں کی گزرگاہ بھی ہے، اس لئے یہ عین ضروری ہے کہ اس راہ پر چلنے والے کا اس راہ کے بنانے والے سے قلبی تعلق قائم ہوتا کہ وہ اسے اس راستے میں اپنی حفاظت میں رکھے۔ اس راستے پر جگہ جگہ شیطان گھات لگائے بیٹھا ہوتا ہے اس لئے ایک مضبوط سہارا چاہئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کون مضبوط سہارا دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ:

''اور اللہ کو مضبوط ہو کر پکڑو، وہی تمہارا مولیٰ ہے، پھر کیا ہی اچھا مولیٰ اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔'' (الحج ۷۸)

تحریکِ اسلامی کی علمی بنیادیں

اس تحریک کی اصلاً دو علمی بنیادیں ہیں۔ ایک قرآن اور دوسری رسول ﷺ کی سنت۔ چونکہ ان دو ذاتوں کی مکمل اتباع کا حکم ہی اسلام کہلاتا ہے۔ باقی سب کی بات اور تعلیمات ان کے ذیل میں رہی ہیں۔

''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی۔'' (النساء ۵۹)

(۱) القرآن الکریم

القرآن الکریم اس تحریک کی پہلی علمی بنیاد ہے۔ جس دین کے غلبہ کا خواب اس کے کارکن دیکھتے ہیں، جس دین کو یہ اونچا کرنا چاہتی ہے، جن اصول و ہدایات کے مطابق یہ تحریک انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ڈھالنا چاہتی ہے اس کے متعلق خالق کائنات اور مالک الملک نے جو کتاب قیامت تک کے لئے نازل کی ہے وہ یہی قرآن کریم ہے۔ اس لئے اس کتاب سے مضبوط تعلق شرطِ اول ہے۔ اور تعلق بھی ایسا کہ اس کی ہدایات زندہ نظر آئیں، نہ کہ محض قصہ کہانی کی طرح سمجھا جائے۔

''اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی، اس حال میں کہ ہر چیز کا واضح بیان ہے اور فرماں برداروں کے لیے ہدایت اور رحمت اور خوشخبری ہے۔'' (النحل ۸۹)

(۲) سنتِ رسول ﷺ:

دوسرا اہم ترین علمی تعلق جو اس قافلہ کا ہم سفر بننے کے لئے درکار ہے وہ سنتِ رسول ﷺ سے ہے۔ اس کی دو کوششیں ہمارے درمیان موجود ہیں، ایک مآخذ حدیث اور دوسرا مآخذ فقہ۔ ان کی روشنی میں سنت کا اصل فہم حاصل کرنے کی راست کوشش کرنی چاہئے۔

''بیشک تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ موجود ہے۔'' (الاحزاب: ۲۱)

تحریکِ اسلامی کے امیر و مامورین کے حقوق

کارکنانِ تحریک کے لئے لازم ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں جو حقوق امیر کے مامورین پر عائد ہوں، انہیں مامورین ہر حال میں خوش دلی کے ساتھ ادا کریں۔ اور جو حقوق مامورین کے امیر پر عائد ہوں، ان میں کوتاہی کرنا تحریک کو نقصان پہنچانا ہے، جس سے ہر حال میں بہ رضا و رغبت امیر کو بچنا چاہئے۔

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔'' (النساء ۵۹)۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

''ہر مسلم شخص پر امام کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا واجب ہے خواہ اس کو وہ چیز پسند ہو یا ناپسند، لیکن جب اس کو معصیت و نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر اس کے اوپر امام کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا واجب نہیں ہے۔ (رواہ مسلم)۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ ایک خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں: ''اے حاکمو! تمہارے اوپر رعایا کے بہت سے حقوق ہیں، ان میں اولین حق عدل کے مطابق فیصلہ کرنا اور مساوات قائم کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کو امام عادل کا مبنی بر انصاف فیصلہ سب سے زیادہ محبوب ہے۔'' (الاستذکار)

●●●

یوم جمعہ کی اہمیت وفضائل

شاہد علی پوسد

اسلام میں جمعہ کے دن کو اول روز سے ہی خاص فضیلت اور اہمیت حاصل رہی ہے۔ جمعہ کے مقام ومرتبہ کو سمجھنے کے لیے صرف اتنی ہی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے عنوان سے سورہ جمعہ نازل فرمائی۔

آپؐ نے احادیث میں اس کے مقام ومرتبہ کو مزید واضح فرمایا ہے۔اس سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

(1) نبیؐ نے ارشاد فرمایا: جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار ہے (ابن ماجہ)

(2) آپؐ نے ارشاد فرمایا: جمعہ کے دن ہی حضرت آدمؑ کو پیدا کیا گیا اور اسی دن حضرت آدمؑ کو اللہ رب العالمین نے جنت میں داخل فرمایا اور اسی دن اس نے آپؑ کو جنت سے نکال کر دنیا میں بھیجا اور اسی دن حضرت آدمؑ کی وفات ہوئی۔

(3) نبیؐ نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کے دن ہی حضرت اسرافیلؑ صور پھونکیں گے اور قیامت بھی جمعہ کے ہی دن قائم ہوگی۔

(4) نبیؐ نے ارشاد فرمایا: جمعہ کا دن دونوں عیدوں سے بہتر دن ہے۔

مذکورہ بالا احادیث سے جمعہ کے مقام ومرتبے کا ہمیں پتا چلتا ہے۔اسی طرح جمعہ اپنی ایک الگ اور اعلیٰ پہچان رکھتا ہے اور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔جمعہ اہل ایمان کے اجتماع اور اظہار یکجہتی کا دن ہے۔جمعہ کا دن بندوں کا اپنے گناہوں کی معافی حاصل کرنے کا دن ہے۔ہفتے بھر کیے ہوئے اعمال کے محاسبے کا دن ہے۔جمعہ کا دن گناہ گاروں اور خطا کاروں کی بخشش کا دن ہے۔یہ دن امت کو درس وتعلیم کے ذریعے جہالت سے نکال کر علم و عمل کی طرف لانے کا دن ہے۔جمعہ کا دن اللہ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی ہے۔

جمعہ کی قدر وقیمت اور اس کے اہتمام کے سلسلے میں امت مسلمہ کی ایک بڑی تعداد کاہلی، سستی، بے رغبتی اور بے حسی کا شکار نظر آرہی ہے۔

عزیز قارئین کرام: امت محمدیہ کو بہت سی خصوصیات اور امتیازات اور مختلف فضائل سے نوازا گیا ہے انہی میں سے ایک جمعہ کا مبارک دن بھی ہے۔

جمعہ کی اہمیت

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: جو پہلے امتیں تھی ان کو جمعہ کے مبارک دن سے محروم کر دیا گیا، یہود کو ہفتہ اور نصاریٰ کو اتوار ملا پھر اللہ نے ہمیں بھیجا اور جمعہ کا دن عنایت فرمایا۔اس ترتیب کو جمعہ، ہفتہ اور اتوار کر دیا گیا، اس لیے قیامت کے روز وہ ہمارے پیچھے ہوں گے حالانکہ دنیا میں ہم تمام سے آخر میں آئے لیکن قیامت کے روز تمام لوگوں کے مقابلے میں ہمارا فیصلہ پہلے ہوگا (مسلم شریف)

نبیؐ نے ارشاد فرمایا: میرے پاس حضرت جبرائیلؑ آئے، انکے ہاتھ میں سفید آئینہ جیسی کوئی چیز تھی اس میں ایک سیاہ نقطہ تھا، میں نے حضرت جبرائیلؑ سے پوچھا۔ یہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ جمعہ ہے۔میں نے پوچھا جمعہ کیا ہے؟ فرمایا: آپؐ کے لئے اس میں خیر ہے۔میں نے پوچھا۔ اس میں کیا خیر ہے؟ فرمایا: وہ آپ اور آپؐ کی امت کے لئے روز عید ہے اور یہود ونصاری تمہارے پیچھے ہیں یعنی ان کی عبادت کے دن بعد میں آرہے ہیں۔میں نے پوچھا۔اس دن میں کیا خاصیت ہے؟ فرمایا اس میں ایک مقبول گھڑی ہے۔میں نے پوچھا اس میں یہ سیاہ نقطہ کیا ہے؟ فرمایا: یہی وہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے جو جمعہ کے دن ہوتا ہے اور یہ دنوں کا سردار ہے،

قیامت کے دن اس کو ہم یوم المزید کہیں گے۔

جمعہ کے احکام وفضائل

(1) جمعہ ہر مسلمان، آزاد، بالغ مرد، صحت مند ومقیم پر فرض ہے۔ اور جس مسافر پر قصر ہے اس پر جمعہ فرض نہیں ہے اور اسی طرح غلام اور عورت پر بھی جو پڑھنا چاہے پڑھ سکتا ہے اور بعض حالت میں شرعی عذر کی بنا پر جمعہ کی فرضیت ساقط بھی ہو جاتی ہے مثلاً شدید مرض یا خوف کی حالت وغیرہ

(2) جمعہ کے دن غسل کرنا نبیؐ کی سنت مبارکہ ہے اور آپؐ نے فرمایا جب کوئی جمعہ کی نماز کے لیے آئے تو اسے غسل کر کے آنا چاہیے (بخاری ومسلم)۔

ایک مقام پر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جمعہ کے دن ہر بالغ نوجوان کے لیے غسل کرنا لازمی ہے اور مسواک کرنا اور خوشبو لگانا بھی اگر میسر ہو (بخاری ومسلم)۔

(3) جمعہ کی نماز کے لیے جلدی جانا مستحب ہے اور اسی طرح تمام طرح کی مصروفیات سے اپنے آپ کو جلدی فارغ کرنا بھی۔ اس سلسلے میں اللہ رب العالمین نے سورہ جمعہ میں فرمایا کہ دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور چھوڑ دو تمام خرید وفروخت (سورہ جمعہ)

(4) حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ نبیؐ نے ارشاد فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن نہایا اور دھویا اور اپنی استطاعت بھر اس نے طہارت اور نظافت کا پورا پورا اہتمام کیا پھر اس نے تیل لگایا، خوشبو لگایا پھر دوپہر ڈھلے مسجد میں جا پہنچا اور مسجد جا کر صف میں بیٹھے ہوئے دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے نہیں ہٹایا پھر اس نے نماز پڑھی، جو بھی اس کے لیے مقدر تھی پھر جب امام ممبر کی طرف نکلا تو چپ چاپ بیٹھا خطبہ سنتا رہا تو اس شخص کے سارے گناہ بخش دیئے گئے جو ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک اس سے سرزد ہوئے تھے۔ (بخاری)

(5) حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ نبیؐ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے روز نہایت اہتمام کے ساتھ اس طرح آیا جیسے پاکی حاصل کرنے کے لیے غسل کرتے ہیں پھر اول وقت مسجد میں جا پہنچا تو گویا اس نے ایک اونٹ کی قربانی کی اور جو اس کے بعد دوسری ساعت میں پہنچا تو اس نے گویا گائے یا بھینس کی قربانی کی اور جو اس کے بعد تیسری ساعت میں پہنچا تو گویا اس نے سینگ والا مینڈھا قربان کیا اور اس کے بعد جو چوتھی ساعت میں پہنچا تو گویا اس نے ایک انڈا راہ خدا میں خرچ کیا پھر جب خطیب خطبہ پڑھنے کے لیے نکل آیا تو فرشتے مسجد کا دروازہ چھوڑ کر خطبہ سننے اور نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آجاتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

جمعہ کے دن کیے جانے والے اعمال

(1) فرشتے بندہ مومن کے حق میں استغفار کرتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا جس شخص نے جمعہ کی شب میں سورہ دخان کی تلاوت کی اس کے لئے ستر ہزار فرشتے استغفار کرتے ہیں اور اس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں (ترمذی شریف)

(2) پانچ ایسے اعمال ایک دن میں کرنے پر جنت۔ حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے ارشاد فرمایا: پانچ ایسے اعمال ہیں، جو بھی شخص ان کو ایک دن میں کرے گا جنت والوں میں لکھا جائے گا (1) بیمار کی عیادت کرنا (2) جنازے میں شریک ہونا (3) روزہ رکھنا (4) نماز جمعہ پڑھنا (5) غلام کو آزاد کرنا (ابن حبان)

(3) دونوں جمعہ کے درمیان نور چمکتا رہے گا۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جو شخص جمعہ کے دن سورۃ کہف پڑھے گا تو اس کے لئے دو جمعہ کے درمیان ایک نور چمکتا رہے گا (نسائی شریف)

(4) دعا کی قبولیت والی گھڑی۔ آپؐ نے فرمایا: جمعہ کے دن میں ایک ایسی ساعت ہے کہ بندہ اس میں جو بھی دعا مانگتا ہے وہ قبول ہوتی ہے۔

(5) نبیؐ کے حضور درود پیش ہوتا ہے۔ نبیؐ نے ارشاد فرمایا: جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو اس روز بہت سے فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور یہ درود میرے حضور میں پیش ہوتا ہے (ابن ماجہ)

(6) بہتر صدقہ کا دن۔ ابن قیمؒ کہتے ہیں کہ عام دنوں کے صدقے سے جمعہ کے دن کا صدقہ بہتر ہے، جس طرح سے عام مہینوں کے صدقے سے رمضان کے صدقے کی فضیلت زیادہ ہے۔ حضرت کعبؓ سے روایت ہے کہ اس دن کا صدقہ دوسرے دنوں کے بنسبت بہتر ہے۔

ذرا غور کیجئے

آپؐ کا اسوہ یہ تھا کہ جمعہ کی تیاری جمعرات ہی سے کر لیا کرتے تھے اور آپؐ جمعہ کے فجر کی تلقین کیا کرتے تھے حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل نماز جمعہ کے دن صبح کی نماز باجماعت ہے یعنی فجر کی نماز، جمعہ کی تیاری کا آغاز ہے۔ جمعہ کی اذان ہونے کے بعد ہر قسم کی مصروفیت کو ترک کر دینا چاہیے کیونکہ ترک کرنے میں ہی خیر اور بھلائی ہے۔ ہمیں ممکنہ حد تک جمعہ ادا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جمعہ کی ادائیگی میں کوتاہی کے نتیجے میں اللہ رب العالمین دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ نبیؐ کا ارشاد مبارک ہے لوگ جمعہ چھوڑنے سے بعض آجائیں ورنہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا پھر وہ لوگ ہدایت سے غافل ہو جائیں گے (مسلم شریف)۔

●●●

ہجرت مدینہ کا پیغام

محمد مدثر ایچولوی

ہجرت ہجر سے ماخوذ ہے جسکا مطلب ہے ترک کرنا، چھوڑ دینا

شریعت کی اصطلاح میں ہجرت ,الإنتقال من بلد الشرك إلى بلد الإسلام, یعنی سرزمین شرک سے سرزمین اسلام کی طرف نقل مکانی کرنے کو کہتے ہیں۔

ہجرت کا ایک معنی یہ بھی ہے'الهجر ما نهى الله عنه و رسوله' یعنی اللہ اور رسول نے جن جن امور سے منع کیا ہے ان کے ارتکاب سے باز آجانا۔

ہجرت نام ہے دیں کی خاطر ایسی جگہ منتقل ہو جانا جہاں اسلام پر آزادی کے ساتھ عمل کرنا ممکن ہو۔

عہد نبوی میں ہجرت مدینہ کی بڑی اہمیت ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی تقویم (کیلنڈر) کے آغاز کے لئے اس کا انتخاب ہوا جب کہ دوسرے عظیم واقعات موجود تھے۔ ہجرت مدینہ کا مطالعہ غلبہ دین کی جدوجہد کرنے والی تحریکات اسلامی کے لیے نہایت ضروری ہے کیوں کہ اس واقعہ میں ایسی عظیم حکمتیں اور دروس پوشیدہ ہیں جو ہمیشہ مجاہدین اسلام کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

معزز قارئین کرام! ہجرت کے دروس اور حکمتوں پر بات کرنے سے پہلے ہجرت سے قبل کے احوال کا جاننا ضروری ہے تا کہ اس وقت کے حالات کی تصویر نگاہوں کے سامنے رہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ساری انسانیت کے لیے تا ابد عملی نمونہ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہر انسان کو ہر موڑ پر رہنمائی نظر آئے گی، خاص طور پر مکہ میں اسلام کے آغاز سے ہجرت مدینہ تک آپ نے جن آلام ومصائب، صبر آزما مراحل اور ہمت شکن حالات کا جس پامردی، استقامت، بلند ہمتی اور منصوبہ بندی سے مقابلہ فرمایا وہ آج بھی سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔نبوت ملنے کے بعد نبی ﷺ کی دعوت وتبلیغ کی جد وجہد کا سیرت کا مطالعہ کرنے سے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں کہ خالق کائنات کا پیغام پہنچانے میں آپ ﷺ نے کس طرح یکسوئی اور صبر کا مظاہرہ فرمایا ہے۔نبی ﷺ نے سب سے پہلے ان کو جن سے ذاتی روابط تھے انہیں اسلام پیش کیا چنانچہ اہلِ علم اور صاحب بصیرت حضرات نے حق کے جام کو برضا ورغبت اپنے لبوں سے لگا لیا اور دارین کی کامیابی کا پروانہ حاصل کرلیا۔اس کے بعد خفیہ تبلیغ ہوتی رہی، سینہ بہ سینہ اسلام کی اشاعت ہوتی چلی گئی۔جب خفیہ تبلیغ سے کسی قدر اسلام پھیل گیا تو آپ ﷺ کو اعلانیہ دعوت پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔آپ ﷺ نے اپنے خاندان اور قبیلہ کے لوگوں کو حق کی طرف بلایا جس کے نتیجے میں غیر تو غیر اپنے بھی خون کے پیاسے ہوگئے، ظلم وستم کا پہاڑ توڑنے لگے،طرح طرح سے ایذائیں پہچانے لگے،نت نئے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے، مارا پیٹا، بیڑیاں لگا کر قید کیا، بے چھت کے کمروں میں بند کیا، تپتی ریت پر گھسیٹا، غرض یہ کہ اسلام کی دعوت کو دبانے اور جڑ سے ختم کرنے کی حتی المقدور کوشش کی گئی۔

تقریبا دس سال تک یہ سلسلہ جاری رہا اور دس سال تک جان کھپا دینے کے باوجود چند لوگوں کے علاوہ اکثریت نے نبی ﷺ کی دعوت قبول نہیں کی، اللہ کی وحدانیت کا اقرار نہیں کیا اور نہ اب کسی سے یہ امید باقی رہ گئی اور اہل مکہ تخم اسلام کے لیے بنجر ثابت ہو چکے تو نبی ﷺ نے طائف کا

رخ کیا کہ مکہ والے نہیں سنتے تو شاید اہل طائف کان دھریں، مکہ کے لوگ اگر نور ہدایت سے محروم رہ گئے تو شاید طائف کے لوگ اللہ کے نور کو قبول کرنے میں سبقت لے جائیں۔ لیکن طائف پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہاں مکہ سے بھی زیادہ ظالم لوگ ہیں۔ انہوں نے نہ صرف نبی کریمؐ کی دعوت کو رد کیا بلکہ آپ کو لہولہان کر دیا۔

نبوت کے گیارہویں سال موسم حج میں نبیؐ کی تبلیغ کی بدولت یثرب (مدینہ) کے چھ لوگوں نے اسلام کی آغوش میں پناہ لی اور وعدہ کیا کہ واپس جا کر وہ بھی اسلام کی فیوض و برکات سے لوگوں کے قلوب کو منور کریں گے۔ چنانچہ اگلے سال ۱۲ لوگ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سات لوگ نئے تھے (یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ دعوت کا مرحلہ کتنا صبر آزما ہے کہ ایک سال میں صرف سات لوگ ایمان لائے اور ہم چاہتے ہیں کہ آج دعوت دی ہے تو کل ہی اسکا نتیجہ بھی نکل آئے) انہوں نے منیٰ میں عقبہ کے پاس آپ ﷺ سے ملاقات کی اور چند باتوں پر بیعت کی۔ سیرت کی کتابوں میں اسکی تفصیل موجود ہے یہ بیعت عقبہ اولی کہلائی اور یہیں سے نبی ﷺ کے لیے راہیں ہموار ہونی شروع ہوگئیں۔ موسم حج ختم ہوا تو انکے ہمراہ نبی کریمؐ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو انکے ساتھ سفیر بنا کر بھیجا تا کہ وہ وہاں اسلام کے نور کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے سعدؓ بن زرارہ کے ساتھ مل کر اہل مدینہ میں جوش وخروش سے اسلام کی تبلیغ شروع کی۔

نبوت کے تیرہویں سال موسم حج میں یثرب کے ستر سے زائد مسلمانوں نے بیعت کی۔ یہ بیعت عقبہ ثانیہ کہلائی۔

اس بیعت کے ذریعے اسلام کفر و جہالت کے لق و دق صحرا میں اپنے لیے ایک نئے وطن کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوگیا اور یہ سب سے بڑی کامیابی تھی جو اسلام نے اپنی دعوت کے آغاز سے اب تک حاصل کی تھی۔ اب وہ وقت آچکا تھا کہ مکہ کو خیر آباد کہہ کر ایک ایسی زرخیز زمین کی طرف گامزن ہوا جائے جہاں اسلام کی لہلہاتی فصل تیار ہو۔ چنانچہ نبی ﷺ نے مسلمانوں کو اپنے اس نئے ملک کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ نبیؐ نے بالکل آخر میں ہجرت کی۔ ہجرت کے اس سفر میں آپؐ نے جس حکمت عملی، منظم پلاننگ اور منصوبہ بندی کا مظاہرہ فرمایا وہ نبیؐ کی دانائی اور حکیمانہ فیصلوں کا مظہر ہے۔

واقعہ ہجرت پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ہر ممکن مادی وسائل اور اسباب اختیار کیے باوجود اس کے کہ اللہ نے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی۔ آیئے ہجرت مدینہ کی اہم حکمتوں اور دروس پر نظر ڈالتے ہیں۔

● دشمن کو اپنے منصوبے سے غافل رکھنا کامیابی کی اولین شرط ہے۔ چنانچہ آپؐ نے ہجرت کی رات حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلایا اور دشمنوں کو بھنک تک نہ لگنے دیا، جب کہ دشمن یہ سمجھتا رہا کہ آپ ﷺ اندر سو رہے ہیں۔ دوسری طرف آپ نے مدینہ کے بجائے دوسری طرف سفر کر کے تین دن تک چھپے رہے، جب یقین ہوگیا کہ کفار مکہ تھک چکے ہیں تو ایسے راستے کا انتخاب کیا جس پر عموماً لوگ سفر نہیں کرتے تھے۔

● انتہائی وفادار اور امانت دار رفیق سفر کا انتخاب۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا رفیق سفر اپنے سب سے معتمد ساتھی کو بنایا جنہیں امت صدیق کے نام سے جانتی ہے۔ آپ نہ صرف انتہائی معتبر اور ذہین ساتھی تھے بلکہ جان پر کھیل کر آپ کی حفاظت کرنے والے تھے۔ صدیق اکبر غار ثور میں تین دنوں کے قیام کی منظم منصوبہ بندی کی جس میں آپ کے بیٹے، بیٹیوں اور غلام نے جان پر کھیل کر کفار مکہ کی چالوں کو ناکام بنایا۔ اسلامی تحریک کی کامیابی کے لیے جہاں انتہائی وفادار افراد درکار ہیں وہیں انتہائی وفادار خاندان بھی ضروری ہے۔

● سفر کے لیے بہتر سے بہتر کی تیاری۔ سفر کے پیش نظر صدیق اکبر نے پہلے ہی سے دو تیز رفتار اونٹنیاں پال رکھی تھیں۔ انہیں کھلا پلا کر خوب تندرست کر دیا تھا۔ غار ثور سے جب مدینہ روانگی کا وقت آیا تو ضروری اشیاء خورد ونوش ساتھ رکھا تا کہ سفر میں کہیں دقت نہ ہو۔

● ماہرین کی خدمات حاصل کرنا۔ عرب میں ریگستان کی وجہ سے راستے کی علامت مٹ جاتی تھیں، چنانچہ راستوں کا علم سفر کے لئے بہت ضروری ہوتا تھا۔ اس کے لئے راستے کے ماہر جانکاروں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ سفر ہجرت کے لیے راستوں کے ماہر عبداللہ بن اریقط کو اجرت پر لیا گیا۔ عبداللہ بن اریقط مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر کسی غیر مسلم کا قابل اعتماد ہونا ثابت ہو تو اس سے اہم کاموں کے لئے اجرت پر خدمات حاصل کی

● خطرناک کاموں کے لئے صالح نوجوانوں کی ضرورت۔ کفار مکہ کی چالوں سے واقفیت اور اپنی حاجات کی تکمیل کے لیے حضرت ابوبکر صدیق کے بیٹے عبداللہ، بیٹی حضرت اسماء اور غلام عامر بن فہیرہ کے ذمہ اہم کاموں کی ذمہ داری سونپی گئی جس کو انہوں نے انتہائی باریکی اور بہادری سے انجام دیا۔ حضرت عبداللہ دن بھر کفار مکہ کے منصوبوں سے واقفیت کے لئے ان کے درمیان گھل مل کر رہتے اور رات میں آکر پوری تفصیل آپؐ سے بتاتے اور پھر اجالا ہونے سے پہلے پہلے کفار مکہ کے پاس پہنچ جاتے اور انہیں بھنک ہی نہ لگتی۔ عامر بن فہیرہ کے ذمہ داری یہ تھی کہ وہ رات میں بکریاں لاتے جس سے آپ ﷺ اور ابوبکر صدیق دودھ حاصل کرتے اور پھر رات ہی میں بکریوں کو اس طرح واپس لے جاتے کہ بکریوں کے کھروں کی کوئی نشانی نہ بچے۔ حضرت اسماءؓ کے ذمہ زادراہ کی تیاری تھی۔ آپ نے یہ کام نہایت مہارت سے انجام دیا۔ ان نوجوانوں کے کارناموں سے یہ سبق ملتا ہے کہ غلبہ دین کی جدوجہد کرنے والی تحریکات میں ایسے نوجوان ضرور ہونے چاہئیں جو نہ صرف بہادر ہوں بلکہ حد درجہ ذہین بھی ہوں اور جان جوکھم میں ڈال کر مقصد کے حصول کو یقینی بنادیں۔

● توکل علی اللہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت کی نہایت باریک منصوبہ بندی کی۔ دشمنوں سے محفوظ رہنے کے تمام ممکنہ ذرائع کو استعمال کیا اور پھر اللہ پر بھروسہ کیا۔ قدم قدم پر اللہ کی نصرت نے آپ کی حفاظت کی۔ گھر سے نکلے تو کفار کو خبر تک نہ ہوئی جبکہ انہوں نے گھر کو گھیر رکھا تھا۔ غار ثور میں قیام کے دوران دشمن بالکل قریب آپہنچا تھا لیکن آپ ﷺ اللہ کی نصرت پر مطمئن تھے، بالآخر دشمن ناکام لوٹ گئے۔ انعام کے لالچ میں سراقہ بن جعشم نے آپؐ کا پیچھا کیا۔ قریب تھا کہ آپ ﷺ کو گرفتار کرلیتا لیکن اللہ کی مدد آئی اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ جب اس نے بار بار کوشش کی تو گھوڑا گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا۔ بالآخر امان لیکر واپس لوٹا۔ تحریک اسلامی کے لیے منظم منصوبہ بندی ضروری ہے، منصوبہ بندی اور اسباب کو اختیار کرنے کے بعد ہی اللہ کی نصرت کی امید رکھنی چاہیے۔ اسی طرح سفر ہجرت میں اہل اسلام کے لیے ایک اہم درس و نصیحت یہ ہے کہ وہ کٹھن سے کٹھن حالات میں اپنے اعصاب اور ذہنی صلاحیتوں پر قابو رکھیں۔ اللہ کی ذات پر کامل توکل کرتے ہوئے بہترین حکمت عملی اختیار کریں۔

موجودہ دور میں مسلمان جس زبوں حالی اور ذلت کا شکار ہیں وہ نبی ﷺ کی سیرت سے دوری اور ضعف ایمانی کا نتیجہ ہے۔ ابھی بھی وقت ہے کہ رجوع کیا جائے اور اسلام کے تقاضوں کو پورا کیا جائے تو کسی کی کیا اوقات کہ ہماری طرف انگلی اٹھا سکے لیکن افسوس ہم نے اب تک ہوش کے ناخن نہ لیے، نتیجتاً ہم ذلت کی زندگی جی رہے ہیں۔ اللہ ہمیں ہجرت کا پیغام سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

●●●

*

● کم سے کم ذمہ داری اٹھانے، کم سے کم ہدف لینے، کم سے کم قربانی دینے اور کم سے کم کی راہیں اور گنجائش تلاش کرنے والے کسی سرکاری گروپ کے تنخواہ دار، کام چور، نکٹھو ملازم تو ہوسکتے ہیں لیکن عالم کفر کو زیر کرنے والی جماعت کے بے لوث، رضا کار اور فی سبیل اللہ کارکن تو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ، اعلیٰ سے اعلیٰ، تیز سے تیز کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ وہ کم کام کو، کم محنت کو توہین سمجھتے ہیں، شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور زیادہ پسینہ گرانے، زیادہ قربانیاں دینے اور زیادہ مشقت کو اعزاز سمجھتے ہیں۔ البتہ ان میں ایک چیز کی کمی ہمیشہ رہتی ہے۔ ناموری، شہرت، ریاکاری، تعریف سازی، دنیاداری اور تکلفات ہمیشہ ان میں کم دکھائی دیں گے۔

● یاد رکھیے! اس جماعت کو وسائل کی کم ضرورت ہے۔ سہولتوں کی کم ضرورت ہے لیکن سب سے زیادہ شدید ضرورت اللہ کے نیک اور مخلص بندوں کی ہے۔ مخلص ساتھی اگر موجود ہوں گے، پیٹوں پر پتھر باندھ کر بھی اللہ کے دین کو بچالیں گے۔ اس کو قائم کرلیں گے، کفر کو مٹادیں گے لیکن اگر متقی اور باوصف ساتھیوں سے ہی جماعت یتیم ہوجائے گی تو پھر سونے اور ہیروں کے ڈھیر بھی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ نہیں سکتے۔ اصل اہمیت افراد کی ہے، نہ کہ وسائل کی۔

(سید محمد اسلم)

قسط نمبر ۵

ہندوستان میں گمراہ کن تاریخ نویسی

مختار احمد مکی

حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں داخلہ اور پلاسی کی جنگ جیتنے کے بعد ۱۸۱۸ء کے وہابی اور فرائضی تحریک اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہند سے گھبرا کر ہندوؤں کے مذہبی جذبات اور احیاء پسندی کو ہر ممکن طریقہ سے ابھارنے کا کام شروع کیا۔ اس زمانہ سے قبل تک کسی بھی ہندوستانی یا غیر ملکی سیاح، مشاہد یا مؤرخ نے ایودھیا میں کسی رام جنم بھومی مندر کا تذکرہ تک نہیں کیا ہے۔ نہ فاہیان یا ہیون سانگ نے اور نہ ہی چودھویں صدی کے سیاح ابن بطوطہ نے۔ ولیم فنچ جو پہلا یورپین سیاح مانا جاتا ہے جب وہ ۱۶۰۸ء میں ایودھیا کا ذکر کرتا ہے تو وہاں کے گھاٹوں اور عقیدوں کا ذکر کرتا ہے۔ مسجد یا جنم بھومی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ بابر کا ایام شہزادگی میں بھیس بدل کر ایودھیا آنے کا ذکر نہ تو تزکِ بابری میں ہے اور نہ ہی گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ میں اور نہ ہی کسی مستند یا غیر مستند تاریخی کتاب میں۔ ابوالفضل نے آئین اکبری اور اکبر نامہ میں صرف اتنا کہا ہے کہ ایودھیا رام چندر جی کے پیدائش کی جگہ کہی جاتی ہے۔ بقول شوشیل شری واستو:

میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ عام عقیدہ کہ بابر یا اورنگ زیب نے ایودھیا میں مندر گرائے ان نظریات کا نتیجہ ہے جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ایجاد کئے گئے۔ انگریز اسکالروں نے اس بات کو ہوا دی کہ بابر ایودھیا آیا تھا۔ کوئی ٹھوس تاریخی شہادت موجود نہیں کہ بابر یا اورنگ زیب کبھی ایودھیا گیا تھا یا اس نے وہاں کسی مندر کو توڑنے کا حکم دیا۔

جب بابر کا ایودھیا آنا ہی مشتبہ ہے تو مسجد کی جگہ مندر کا ہونا اور بھی مشتبہ ہے۔ اگر ایسا کوئی مندر تھا تو اسے کوشلیہ بھون کی جگہ ہونا چاہئے۔ پروفیسر ہربنس لال مکھیا کے لفظوں میں:

۱۸۸۲ء کے بعد یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ مسجد کی جگہ مندر تھا اور نہ کسی مسلمان یا ہندو کی کتاب میں ایسی کوئی شہادت موجود ہے.... یہ محض قیاس ہے واقعہ نہیں کہ یہاں مندر تھا۔ اور قیاس بھی اسی بنیاد پر ہے کہ چونکہ بابر مسلمان تھا اس لیے ضرور اس نے مندر توڑا ہوگا۔

سنگھ پریوار سے وابستہ ماہرین آثار قدیمہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود ابھی تک ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے ایودھیا میں کسی رام مندر کے وجود کو ثابت کیا جاسکے۔ الہ آباد سے شائع ہونے والے اخبار پانیر کے ۹/فروری ۱۹۸۶ء سے ۱۲/فروری ۱۹۸۶ء کی چار اشاعتوں میں سنگھ پریوار کی جانب سے 'تو جک بابری' کے صفحہ ۵۳۲ کے حوالہ سے تاریخی ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے مطابق مغل بادشاہ بابر نے رام جنم بھومی کو ۱۵۲۸ء میں بابری مسجد میں بدل دیا، لیکن ایسا کرنے میں اس کو ہندوؤں کی پانچ شرطیں منظور کرنی پڑیں۔ یہ شرطیں تھیں: مسجد کا سیتا پاک ہوگا، اس میں مینار نہیں ہوگا، مسجد کے پاس ہندوؤں کے لیے پری کرما بنایا جائے گا، اس کا پھاٹک صندل کا ہوگا اور ہندوؤں کو اس میں پوجا کی اجازت ہوگی۔ کالم نگار کا یہ بھی کہنا ہے کہ بابر نے رانا سانگا سے پہلی جنگ آگرہ کے پاس فتح پور سیکری میں لڑی اور شکست کھانے پر بھاگ کر ایودھیا میں چلا گیا۔ وہاں وہ دو مسلم صوفی بزرگ جلال شاہ اور خواجہ کجل عباس قلندری سے ملا۔ یہ دونوں مہاتما شیانند جی

کے چیلے تھے اور دونوں ہی اپنے گرو کے آشیرواد سے مسلمان ہوئے تھے۔ ان دونوں نے بابر کی کامیابی کے لیے دعائیں کیں۔ ساتھ ہی بابر سے کہا کہ رام جنم بھومی ایک پوتر اور اوتاری جگہ ہے، اس جگہ پر ایک خردمکہ بنایا جائے۔ بابر نے جب فتح پور سیکری کی دوسری لڑائی جیت لی تو وہ دوبارہ ایودھیا آیا اور رام جنم بھومی کو گرا کر اس کی جگہ اپنے فوجی سردار 'میر بانکی' کو مسجد بنانے کا حکم دیا۔ لیکن مسجد کے لیے جو دیوار دن میں اٹھائی جاتی وہ رات میں گر جاتی۔ 'میر بانکی' نے بابر کو ایودھیا آنے کی دعوت دی۔ بابر نے یہاں آ کر سادھوؤں اور مہاتماؤں کی مندرجہ بالا پانچ باتیں منظور کیں تبھی جا کر وہ عمارت بن سکی۔ پانیر کے کالم نگار کا یہ بھی کہنا ہے کہ دیوانِ اکبری کے مطابق اکبر نے بیربل اور ٹوڈرمل کو بھیج کر ہندوؤں کے مہاتماؤں اور سادھوؤں سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ مسجد کے باہر بائیں جانب ایک چبوترہ بنالیں جو رام مندر کہلائے گا۔ یہاں سے وہ پوجا پاٹ اور درشن کرسکیں گے۔ اکبر نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ ہندوؤں نے کم سے کم ۲۰ مرتبہ اس پر حملہ کیا تھا۔

لیکن افسانہ یا کہانی میں کوئی دم نہیں ہے۔ تو جک بابری کے نام سے کوئی کتاب نہیں ہے۔ بابر کی خود نوشت تزکِ بابری ترکی زبان میں موجود ہے۔ اے۔ ایس۔ بیورخ نے اس کا انگریزی ترجمہ بابر نامہ کے نام سے کیا ہے جو موجود ہے اردو ترجمہ تزکِ بابری اردو معروف بہ بابر نامہ ہے۔ اس کے انگریزی ترجمہ کے صفحہ ۵۳۲ پر ایسی کوئی بات لکھی ہوئی نہیں ہے۔ ترکی نسخہ میں صرف ۳۸۲ صفحات ہیں۔ رانا سانگا سے بابر کی کوئی لڑائی فتح پور سیکری میں نہیں ہوئی تھی جس میں اس نے شکست کھائی ہو بلکہ صرف ایک جنگ کنواہہ کے میدان میں ہوئی تھی جس میں بابر کامیاب رہا تھا۔ خواجہ قزلباش اور جلال سے بابر کی ملاقات بھی محض افسانہ ہے۔ 'میر بانکی' نام کا بھی کوئی فوجی سردار نہیں بلکہ وہ میر باقی ہے۔ بابر نے اپنے سوانح تزکِ بابری میں اپنی زندگی کے تمام واقعات خواہ وہ انتہائی معمولی ہی کیوں نہ ہو تحریر کیا ہے۔ جس میں شراب نوشی اور معجون کھانے کے علاوہ ہندوستانی موسم، لوگ اور پھلوں پر بے لاگ تبصرہ، جنگ میں فتح کے بعد سروں کا مینارہ بنانے، باغات کی سیر و تفریح اور تمام معرکوں کی تفصیلات کے ساتھ ہی شراب نوشی سے توبہ، نماز اور روزہ کا ذکر موجود ہے۔ اس کے مطابق وہ پورب کے افغان سرکشوں کو دبانے کے لیے اودھ آیا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے جین تیمور سلطان، شیخ بایزید، تردی بیگ، فوج بیگ، بابا چہرہ باقی شقاول، گومتی، گھاگھرا اور سریوندی کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس کتاب میں رام جنم بھومی، جلال شاہ، خواجہ کجل شاہ، سادھو اور مہاتماؤں سے کسی معاہدہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس طرح دیوانِ اکبری کے نام سے کوئی کتاب موجود نہیں جو اکبر کے زمانہ میں لکھی گئی ہو۔ ابوالفضل نے آئین اکبری لکھی ہے لیکن اس کے کسی صفحہ پر بیربل اور ٹوڈرمل کے حوالہ سے ایودھیا کے سادھو اور مہاتماؤں سے ملنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ ساری باتیں من گڑھت ہیں اور حقیقت سے اس کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں۔

بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر سید شہاب الدین کا کہنا ہے کہ:

ایسا کوئی ثبوت یا شہادت موجود نہیں کہ شری رام کی جائے پیدائش پر بنائے گئے مندر کو ۱۵۲۸ء میں گرا کر مسجد بنائی گئی۔ پہلے یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس مندر کو راجہ بکرماجیت نے ۵۰ سال قبل مسیح بنوایا تھا مگر بدقسمتی سے دو مشہور سیاح فاہیان اور ہیون سانگ نے کبھی بھی اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ تب یہ کہا گیا کہ اس مندر کو گیارہویں صدی میں قنوج کے راجہ نے بنایا تھا۔ اودھ کا علاقہ دسویں اور گیارہویں صدی میں مسلسل اور متواتر افغان حملوں کا نشانہ بنا رہا۔ حیرت ہے کہ ان حالات میں بھی یہ مندر بنتا رہا۔ بارہوی صدی کے آخر سے ایودھیا مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ ساڑھے تین سو سالوں میں ان مسلمان حکمرانوں نے اس کو کچھ بھی نہیں کیا اور اسے توڑنے کا کام بابر کے لیے چھوڑ دیا۔

۲۰ر جنوری ۱۵۲۶ء کو بمقام دھولپور فارسی زبان میں ہمایوں کے لیے جو وصیت نامہ بابر نے تحریر کیا ہے وہ بابر کے مزاج کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اس کا ایک اقتباس اس طرح ہے کہ:

اے میرے فرزند! ہندوستان مختلف مذاہب سے بھرا پڑا ہے۔ بحمداللہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے اس پر تمہیں بادشاہی عطا فرمائی۔ تمہیں لازم ہے کہ اپنے دل کو ہر قسم کے مذہبی تعصبات سے خالی کر کے ہر قوم کے طریقہ کے مطابق عدل و انصاف کرو۔ اپنی بادشاہی کے اندر کسی قوم کی عبادتگاہوں کو

خراب یا مسمار مت کرنا۔ ایسا انصاف کرنا کہ بادشاہ رعیت سے اور رعیت بادشاہ سے خوشحال ہو جائے۔ اسلام کی ترقی تیغ وظلم کے بجائے تیغِ احسان سے زیادہ بہتر ہے۔ مختلف العقیدہ رعایا کو عناصر اربعہ کی طرح متحد کر دو تا کہ سلطنت کا جسم امراض مختلفہ سے محفوظ رہے۔

بابر کے سلسلہ میں ہندو مؤرخین بھی اس کی شخصیت کی دل آویزی کے قائل رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں تحریر کرتے ہیں:

وہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں نمونے کا بادشاہ تھا۔ وہ مہم جو تھا، آرٹ، لٹریچر اور اچھی زندگی کا شائق تھا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی اپنی کتاب رائز اینڈ فال آف مغل امپائر میں تحریر کرتے ہیں کہ:

بابر میں مذہبی جنون بالکل نہیں تھا۔ اس کا رویہ ہندو افغانی امراء اور رعایا کے ساتھ مہذبانہ، شریفانہ اور دوستانہ تھا.... مغل سلطنت کی شان وشوکت صرف اس کی فوجی قوت میں نہیں بلکہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ ان کی مذہبی رواداری میں تھی۔ اس کی ابتداء بابر سے ہوئی تھی۔

رام اور رامائن بذاتِ خود متنازعہ ہیں۔ راج مندری (دکن) کے ملا دین کٹارتنم اپنی کتاب ''مصر کا فرعون-رام'' میں تحریر کرتے ہیں کہ:

رامائن ایک مصری فرعون رامسیز ثانی کی کہانی سے ماخوذ ہے۔ خود رام کا نام ہندی الاصل نہیں بلکہ سامی الاصل ہے۔ سیریا کے ایک بادشاہ کا یہی نام تھا۔ سیتا بھی ایک قدیم مصری نام ہے جو آج بھی دولت منداور متمول گھرانہ میں عام ہے۔ قاہرہ میں آج بھی ایک مسجد سیتا زینب کہلاتی ہے۔ خود رامائن کے مطابق بالمیک ہندو نہیں بلکہ بدیسی نووارد تھا۔ برہما نے اپنے بیٹے نرو کو آسمان سے اس داستان کو سنانے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ قصہ سنا کر وہ آسمان کی طرف لوٹ گیا۔

کٹارتنم کا خیال ہے کہ یہ ایک مصری کہانی ہے جس کو ہندوؤں کے مزاج کے مطابق ایک مقدس رنگ وروپ دے دیا گیا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ رام نام کے کسی بادشاہ کا ذکر ہندوستانی تاریخ میں نہیں ملتا۔ رامائن کے مطابق راجہ دسرتھ نے دس ہزار برس اور رام نے گیارہ ہزار برس تک حکومت کی اور اگر ان دونوں کا زمانہ حضرت عیسیٰؑ سے پچیس ہزار سال قبل مان لیا جائے تو ان دونوں کا عہد حکومت چھیانوے ہزار سال قبل مسیح ہوتا ہے۔ جب کہ رامائن میں ہی گوتم بدھ کا ذکر موجود ہے جو کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں تھے۔

اس طرح چیدانند داس گپتا نے السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا کے ۱۵؍جون ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں تحریر کیا ہے کہ وید کے مطابق دسرتھ اور رام وارانسی کے راجہ تھے۔ دسرتھ جاتیکا میں بھی انہیں وارانسی کا ہی راجہ بتایا گیا ہے۔ مزید یہ کہ سیتا کا تعلق راجہ جنک سے نہیں تھا بلکہ وہ رام اور لکشمن کی سگی بہن تھی۔ اس کے علاوہ رام کے جس لنکا کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ سری لنکا نہیں بلکہ وہ مدھیہ پردیش کی ایک جگہ ہے۔

پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی ۱۹۵۵ء کے بنگالی ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک جرنل میں تحریر کردہ اپنے مضمون میں کہتے ہیں کہ:

رامائن کا قصہ ہومر سے مستعار لیا گیا ہے کیونکہ دس سروں والے راکشش کا وجود یونانی تخیل کی بازگشت ہے۔ ہندوؤں کی قدیم ترین خرافاتی ادب میں بھی ایسے راکشش کا ذکر موجود نہیں ہے۔

مختلف شواہد کی بنیاد پر ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ رام اور سیتا حقیقی بھائی بہن تھے اور ازدواجی رشتہ میں بھی منسلک تھے۔

الہ آباد ہائی کورٹ نے بابری مسجد کیس کی سماعت کرتے ہوئے ۵؍مارچ ۲۰۰۳ء کو محکمۂ آثار قدیمہ کے ذمہ یہ کام سونپا کہ وہ کھدائی کے بعد یہ پتہ چلائے کہ بابری مسجد سے پہلے اس جگہ پر کوئی مندر تھا یا نہیں۔ محکمۂ آثار قدیمہ کی جانب سے کھدائی کے دوران وقفہ وقفہ سے جو رپورٹ عدالت کو پیش ہوتی رہی اس میں یہ واضح طور پر کہا گیا کہ اس جگہ پر کسی مندر کی موجودگی کا کوئی آثار یا ثبوت نہیں ملا ہے۔ لیکن سب سے آخر میں جو رپورٹ ۲۲؍اگست ۲۰۰۳ء کو عدالت میں یکا یک داخل کی گئی اس میں حیرت انگیز طور پر دعویٰ کیا گیا کہ وہاں مندر تھا۔ غیر وابستہ سیکولر مؤرخین نے انتہائی حیرت کے ساتھ اس رپورٹ کو پڑھا اور اس کے مختلف نکات پر تبصرہ کیا۔ ایک مشہور مؤرخ پروفیسر عرفان حبیب نے اپنے ایک انٹرویو میں بہت واضح الفاظ میں کہا کہ

سنگھ پریوار کے لوگ جھوٹ بولتے ہیں کہ وہاں کوئی مندر تھا۔ان کا کہنا ہے کہ اس پوری رپورٹ کے ہر باب پر محکمۂ آثار قدیمہ کے افسران کے دستخط ہیں لیکن آخری باب جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہاں کوئی مندر تھا کسی کا بھی دستخط نہیں۔ مزید یہ کہ اس کی زبان پچھلے تمام باب کی زبان سے ایک دم مختلف ہے اور اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جسے محکمۂ آثار قدیمہ کے افراد استعمال نہیں کرتے ہیں۔اس کے علاوہ کھدائی کے دوران زمین پر موجود فرش کو مندر کا فرش بتایا گیا ہے جب کہ وہ فرش چونا اور سرخی کے بنے ہوئے ہیں جن کا استعمال اس زمانہ میں صرف مسلمان ہی اپنی عمارتوں میں کیا کرتے تھے۔مزید یہ کہ ان فرشوں پر ذبح کئے گئے جانوروں کی ہڈیاں ملی ہیں۔ظاہر ہے مندروں میں جانور ذبح نہیں کئے جاتے۔

بابری مسجد کے ملبہ میں شیو، وشنو، بدھ اور جین کی مورتیاں ایک ساتھ ملی ہیں۔مندر کسی ایک بھگوان کا ہوسکتا ہے۔''کمپوزٹ ہندو ٹیمپل'' کی کوئی مثال دنیا میں موجود نہیں۔مزید یہ کہ کھدائی کے دوران ایک کتبہ کا ٹُکڑا بھی ملا ہے جس کا رسم الخط تیرہویں چودھویں صدی کا ہے۔کھدائی کے دوران گلینرڈ ٹائیلس بھی ملے ہیں جو کسی مسجد میں ہی ممکن ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے وہاں سلطانی عہد کی کوئی مسجد تھی اور اس خستہ حال عمارت کو توڑ کر بابری مسجد تعمیر کی گئی۔کھدائی کے دوران دیوی دیوتاؤں کے ٹوٹے پھوٹے پتھروں سے بنی دیوار بھی ملی ہے جس میں ایک خاص طرز کے محراب اور طاق موجود ہیں جو صرف مسجدوں میں ہوتے ہیں لیکن اسے مندر کا بتایا جارہا ہے۔ اس طرح وشال مندر میں پچاس ستون ٹیڑھا میڑھا کنکریٹ ہے۔ظاہر ہے مسجد کی چھت کسی ستون کے سہارے ہی کھڑی رہی ہوگی۔بقول پروفیسر سورج بھان:

جسے یہ مندر کی دیوار بتاتے ہیں درحقیقت وہی یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ مندر کے نہیں بلکہ مسجد کے ہیں اور چاروں فرش جو انہیں ملے ہیں وہ بھی مسجد کے ہی ہیں۔

اس زور زبردستی اور مسخ شدہ تاریخ نویسی کا ہی نتیجہ ہے کہ امولیہ گنگولی ہندوستان ٹائمس میں چھپے اپنے ایک مضمون ونڈلزم اہٹ دی ڈور (دروازہ پر ایک وحشیانہ رقص) میں لکھتے ہیں کہ:

بابری مسجد پر حملہ کے دوران سنگھ پریوار کے جنونی کارسیوک ''تین نہیں تین ہزار، نہیں رہے گا ایک مزار'' کا نعرہ لگا رہے تھے۔اس کی شروعات بابری مسجد کی شہادت سے ہو چکی ہے۔ان لوگوں نے متھرا اور بنارس کی جامع مسجد پر اپنی نظریں تو پہلے سے ہی گاڑ رکھی ہیں جس کا اشارہ کاشی کے شنکراچاریہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ذمہ داروں سے گفتگو کے دوران دیا تھا کہ مسلمانوں کو متھرا اور بنارس کی مسجد بھی چھوڑنے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔اور نہ صرف اتنا ہی بلکہ سنگھ پریوار کے ایک ممبر پرپھل گورادیہ نے پائنیر میں چھپے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ان کے نشانہ پر کرناٹک کے بابا بندی گیری کا مزار اور مدھیہ پردیش کی بھوج شالا مسجد بھی ہے جسے وہ مندر بنانا چاہتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ اجمیر کے نزدیک اڑھائی دن کا جھونپڑا، مالدہ ضلع کی آدینہ مسجد، جونپور کی اٹلہ دیوی مسجد اور بھوپال کے نزدیک ویدیشیا میں بیجامنڈل وغیرہ بھی ہیں۔اس کے لیے مندروں کے مسمار کی نئی نئی کہانیاں گڑھی جارہی ہیں..... ان سب کا مقصد گروگوالکر اور گوڈسے کا ہندوستان بنانا ہے جو کہ ہندو راشٹر ہوگا جس میں مسلمان اور دوسرے اقلیتی گروہ محض دوسرے درجہ کے شہری ہوں گے جنھیں کوئی اختیار نہیں ہوگا۔

اس طرح کی تاریخ نویسی جنگل کی حکومت یا فاشسٹ اور فرقہ پرست ذہنیت کی غمازی کرتی ہے۔امولیہ گنگولی مزید کہتے ہیں کہ:

اس کے لیے ہندوستان کے وزیر برائے انسانی وسائل ونشو ونما پروفیسر جوشی نے قومی کونسل برائے تعلیم، تحقیق وتربیت (NCERT) اور یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (UGC) میں اپنے کارسیوک بحال کررکھے ہیں جو اسی نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے تاریخ مرتب کررہے ہیں تاکہ اگلی نسل یہ جان نہ سکے کہ گاندھی جی کو ایسے ہی ہندو جنونیوں نے شہید کیا تھا۔ ہندوستان چھوڑو تحریک کی مخالفت کمیونسٹ اور جناح کے پیروکار کے علاوہ آر ایس ایس کے لوگوں نے بھی کی تھی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لوگ سرے سے تحریک آزادی کے ہی مخالف رہے۔

●●●

قسط نمبر ۵

اسرائیل کی تعمیر میں اشتراکی ممالک کا کردار

خلیل احمد حامدیؒ

اسرائیل کو تسلیم کرنے میں مسابقت!

قراردادِ تقسیم کے ہیروؤں نے صرف اقوام متحدہ سے یہ ظالمانہ قرارداد منوانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اسے بزورِ طاقت نافذ کرنے کے لیے صہیونیوں کی پوری پوری مدد کی اور بالآخر جب ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوا تو اس کے دس منٹ بعد تل ابیب پر اس ریاست کو تسلیم کر لینے کے برقیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ سب سے پہلا برقیہ، جس میں اسرائیل کو تسلیم کیا گیا، امریکہ کے صدر ٹرومین کا تھا، اس کے چار منٹ بعد اسٹالن کا برقیہ پہنچ گیا اور پھر کمیونسٹ ممالک اور مغربی یورپ کے ممالک کے برقیے پہنچے۔ مغربی یورپ کے برقیوں میں سب سے پہلا برطانیہ کا برقیہ تھا۔ اسٹالن کا برقیہ، جو اس وقت ماسکو ریڈیو نے نشر کیا تھا اور یورپ اور امریکہ کے اخبارات میں بھی چھپا اس لحاظ سے ممتاز اور منفرد برقیہ تھا کہ اس میں بڑے پُرکشش اور ہمدردانہ اور حوصلہ افزا الفاظ میں اسرائیل کے فروغ کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔

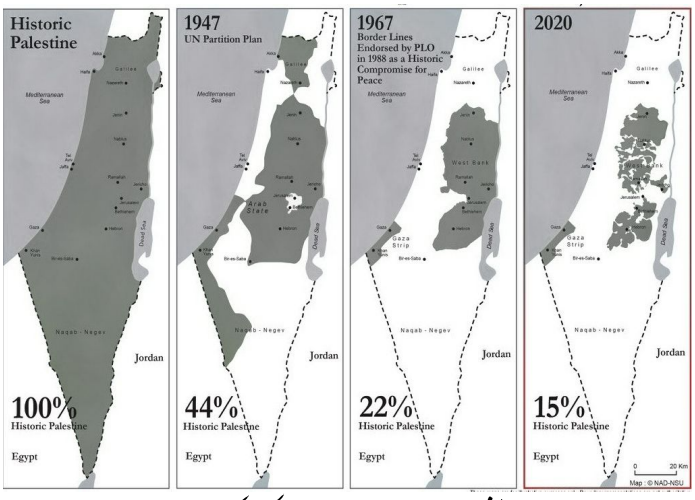

امریکہ اور روس دونوں اسرائیل کے بانی ہیں

اس تاریخ سے یہ بات بالکل ناقابل انکار حد تک واضح ہے کہ بین الاقوامی طاقتوں نے مل کر اسرائیل کو جنم دیا اور مغربی بلاک اور مشرقی بلاک (بزیر قیادت روس) دونوں نے اس میں ملی بھگت کا ثبوت دیا۔ روس نے دراصل ”دولتِ یہود“ کے تصور کو اشتراکی بنیادوں پر جامۂ عمل پہنانے کی سعی کی اور اس معاملے میں اس کے پیش نظر اسی منصوبہ پر عملدرآمد کرنا تھا جو اشتراکی تحریک کے یہودی زعماء نے وضع کیا تھا۔ یہی وہ زعماء تھے جنھوں نے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں خود روس کے بالشویک انقلاب

کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اسرائیل کے بارے میں بلاشبہ اس حد تک روس کا منصوبہ ضرور کامیاب ہوگیا کہ ایک یہودی ریاست وجود میں آگئی۔ مگر روس کی یہ کوشش وسعی ناکام ثابت ہوئی کہ یہ ریاست خالصۃً کمیونسٹ ریاست بن جائے۔ اس کی وجہ زعمائے صہیون کی یہ اسکیم ہے کہ صہیونیت کو بیک وقت کمیونزم اور مغربی سرمایہ داری، دونوں سے رشتہ برقرار رکھنا ہے اور دونوں سے اپنے مقاصد کی خدمت لینی ہے۔

اسرائیل اور اشتراکی ممالک کے دوستانہ معاہدے

اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسرائیل کی یہودی ریاست قائم ہوجانے کے بعد اشتراکی ممالک نے اسے پروان چڑھانے کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ مشرقی کیمپ اور خاص طور پر سوویت یونین، یوگوسلاویہ، چیکو سلواکیہ اور رومانیہ نے اسرائیل کے ساتھ اقتصادی، ثقافتی اور فنی تعلقات کو قائم کرنے اور بڑھانے میں مغربی کیمپ سے ہمیشہ سبقت کی ہے۔ چنانچہ اسرائیل نے سب سے پہلا معاہدہ جو کسی بیرونی ملک کے ساتھ کیا وہ وہ معاہدہ تھا جو اسٹالن کے عہد میں سوویت یونین کے ساتھ کیا گیا۔ اس ابتدائی معاہدے کے بعد خروشچیف کے دور میں پے در پے تجارتی، ثقافتی اور سیاسی معاہدات استوار کیے گئے۔ ان سب پر مستزاد وہ معاہدہ ہے جو بحری تجارت کے میدان میں اسرائیل سے کیا گیا ہے اور جس کی رُو سے روس کے تجارتی جہاز اسرائیلی بندرگاہوں کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اسرائیل بالفعل روسی جہازوں کے ذریعہ سے ہی ایشیا کی منڈیوں اور مشرقی یورپ اور افریقہ کے ممالک میں اپنی برآمدات منتقل کررہا ہے۔ صرف ۱۹۶۴ء میں اسرائیل اور روس کے درمیان تین معاہدات قائم ہوئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تجارتی معاہدہ: اس معاہدے کے رُو سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی اشیاء کے تبادلہ کو ترقی دی جائے گی۔ روس اسرائیل سے فاسفیٹ، کیمیاوی اشیاء اور پارچہ جات خریدے گا اور اسرائیل روس سے انجن، بجلی کے آلات اور پشم درآمد کرے گا تاکہ اپنے کارخانوں میں تیار کرکے اُسے یہودیوں کی تجارتی کمپنیوں کے ذریعہ مغربی یورپ اور امریکہ میں فروخت کرے۔

۲۔ سیاحت کا معاہدہ: دونوں ملکوں کے درمیان سیاحت کو ترقی دی جائے گی اور اس میدان میں ہر طرح کی سہولتیں بیش از بیش فراہم کی جائیں گی۔ روسی اور اسرائیلی مزدوروں کے مابین روابط کو نشو ونما دیا جائے گا۔ دونوں ملکوں میں فنکاروں، سائنس دانوں اور مصنفین کے باہمی تبادلہ اور دوروں کے لیے سالانہ پروگرام وضع کیے جائیں گے۔ چنانچہ اسی معاہدہ کی رُو سے ۱۹۶۴ء میں ہزاروں روسی سیاح اسرائیل میں داخل ہوئے ہیں اور اُدھر یہودی نوجوانوں اور عمال کے متعدد وفود سوویت یونین کا دورہ کرچکے ہیں۔

۳۔ بحری نقل وحرکت کا معاہدہ: دونوں ملکوں کے درمیان مشترک بحری تجارت کی درآمد و برآمد میں پوری سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ اسرائیل کے تجارتی جہازوں کو اجازت ہوگی کہ وہ سامان تجارت کو لادنے اور اتارنے اور ایندھن حاصل کرنے کے لیے روسی بندرگاہوں کو استعمال کریں۔ اس کے بالمقابل روس کا تجارتی بیڑہ اسرائیلی بندرگاہوں کے استعمال کا مجاز ہوگا۔

اسرائیل اور روس کے مابین جتنے معاہدات ہوئے ہیں ان کی دیکھا دیکھی دوسرے اشتراکی ممالک نے بھی ۱۵ سالوں کے اندر اسرائیل کے ساتھ متعدد معاہدات استوار کیے ہیں۔ ان ملکوں کے ساتھ اسرائیل کے معاہدات کا اجمالی بیان یہ ہے:

یوگوسلاویہ کے ساتھ	۴ معاہدات	ابھی تک قائم اور جاری ہیں۔
چیکوسلواکیہ کے ساتھ	۵ معاہدات	// //
رومانیہ کے ساتھ	۴ معاہدات	// //
بلغاریہ کے ساتھ	۳ معاہدات	// //
پولینڈ کے ساتھ	۳ معاہدات	// //
ہنگری کے ساتھ	۳ معاہدات	// //

اشتراکی ممالک اسرائیل کی منڈی ہیں

اشتراکی ممالک کی ہر گونہ مدد کی بدولت، جس میں اسرائیلی مصنوعات کے لیے منڈیاں مہیا کرنا اور اسرائیل کو ہر نوعیت کے میکانکی آلات فراہم کرنا بھی شامل ہے، اسرائیل نے قلیل مدت میں ترقی کے کئی مراحل طے کرلیے اور اس کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ اسرائیل اپنی فاضل زرعی پیداوار (پھل اور غلّہ) کا ۶۰ فیصد، کیمیاوی اشیاء کا ۴۰ فیصد اور مختلف مصنوعات کا ۵۰ فیصد

مشرقی یورپ کے ممالک اور روس کو برآمد کرتا ہے۔ ان ممالک میں یوگوسلاویہ پیش پیش ہے جس نے اسرائیل کے ساتھ پچھلے چند سالوں میں تجارتی تعلقات کو بڑی وسعت دی ہے۔ یعنی ۱۹۷۰ء تک اس کے تعلقات کی جو نسبت تھی اُس کے بعد یہ نسبت تین گنی بڑھ گئی۔

جو بات خاص طور سے توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ اسرائیل اشتراکی بلاک سے جو اشیاء درآمد کرتا ہے اُن کا بڑا حصہ افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک کو برآمد کر دیتا ہے۔ اسرائیل کی اپنی مصنوعات کا بھی یہ حال ہے کہ جو افریقی ممالک اسرائیل کے ساتھ تجارتی اور فنی معاہدوں میں منسلک ہیں ان کی منڈیوں میں اسرائیلی مصنوعات کی بھرمار ہو رہی ہے اور قریب قریب اسرائیلی مصنوعات نے منڈیوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اسرائیل کی صنعتی و زرعی ترقی میں کمیونسٹ ممالک کا حصہ

صنعتی اور زرعی پہلوؤں کو لیجئے۔ ایوان ہائے تجارت کے اعلامیوں اور بین الاقوامی صنعت کے اعداد و شمار اور یورپ اور اسرائیل کے سرکاری مآخذ اور بین الاقوامی عالمی تجارت کی گائیڈ بکس کو دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسرائیل میں جتنے کارخانے قائم کیے گئے ہیں اور اسرائیلی ماہرین زراعت کے میدان میں جتنی مشنری استعمال کر رہے ہیں اس کا بڑا حصہ کمیونسٹ بلاک سے اسرائیل نے درآمد کیا ہے اور کچھ مغربی یورپ اور امریکہ سے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اعداد و شمار:

۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۵ء	کل تعداد	کمیونسٹ بلاک سے درآمد کردہ	مغربی ممالک سے درآمد کردہ
شکر سازی کے کارخانے	۳	۲	۱
دودھ اور پنیر تیار کرنے کی فیکٹریاں	۱۲۵	۹۰	۳۵
رس نکالنے کی فیکٹریاں	۱۴	۸	۶
بیجوں کے تیل اور کھل صاف کرنے کے کارخانے	۱۰	۶	۴
فلور ملز	۵۰	۳۰	۲۰
پارچہ بافی کی ملیں	۹	۵	۴
جوتے بنانے کی فیکٹریاں	۲۶	۹	۱۷
کیمیاوی کھاد کی فیکٹریاں	۲	۱	۱
مختلف کیمیاوی اشیاء کے کارخانے	۷	۳	۴
دواسازی کے کارخانے	۵	۳	۳
بجلی کا سامان تیار کرنے والی فیکٹریاں	۸	۳	۵
پاور ہاؤس	۷۰۰	۵۰۰	۲۰۰
لکڑی کے کام کی ورکشاپیں	۵۰	۳۵	۱۵
سمنٹ کی فیکٹریاں	۴	۳	۱
گلاس کی فیکٹریاں	۳	۲	۱
پٹرول صاف کرنے کے کارخانے	۲	۰	۲
زرعی ٹریکٹر وغیرہ	۲۰۰۰	۱۵۰۰	۵۰۰
غلّہ کاٹنے اور گاہنے کی مشینیں	۳۰۰۰	۲۰۰۰	۱۰۰۰

ان اعداد و شمار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسرائیل کی صنعتی ترقی کا دارومدار امریکہ اور مغربی یورپ کی بافراط امداد کے علاوہ روس اور وارسا پیکٹ سے وابستہ کمیونسٹ ممالک پر ہے۔ یہ بات بھی خلاف حقیقت نہیں ہے کہ اسرائیل نے مغربی کیمپ سے خوب خوب فوائد حاصل کیے ہیں۔ خاص طور پر امریکہ ہر سال مشرقِ اوسط اور افریقی ممالک اور ایشیا کی بعض پسماندہ ریاستوں کو جو امداد بھیجتا ہے اسرائیل بھی اُس سے خاطر خواہ حصہ لیتا ہے۔ اسرائیل کے اکثر و بیشتر آبی منصوبے جنہیں وہ مکمل کر چکا ہے، پختہ شاہراہیں، زرعی اصلاحات اور معدنی دولت کی تلاش و تحقیق (جسے وہ دریافت کر چکا ہے اور اس سے استفادہ کر رہا ہے) ان تمام مدّوں کو اس نے امریکی امداد اور امریکہ اور یورپ کی یہودی کمپنیوں اور تنظیموں کے عطیات سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

●●●

چند ذہنی الجھنیں اور ان کا حل
ایک مکتوب، دوست کے نام

سید اسعد گیلانی

رفیق عزیز! مالک الملک کی رحمت وسلامتی تمھیں اپنی پناہ میں رکھے۔

ایک مدت کے بعد تم نے اپنے حالات و کوائف سے آگاہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس جہان کی پہنائی میں کھو گئے تھے۔ ماضی کے وسیع نشیب وفراز میں کتنے ہی احباب ہیں جنھوں نے حافظے کے وسیع میدان میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ ان کو آواز دیں تو انھیں سنائی نہیں دیتی۔ انھیں بلائیں تو کوئی جواب نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حافظے کی دھندلی شاہراہ پر گزرے ہوئے راہ گیروں کے نقوشِ قدم ہیں جو ایام کی گرد کے نیچے مدھم پڑتے جارہے ہیں۔ تم بھی انھی مدھم نشانات میں سے ایک نشان بن کر رہ گئے تھے۔

تم نے یہ کیا لکھ دیا کہ:

''میرے لیے دعا کرو۔ نماز سے رغبت کم ہوگئی ہے۔ دعوتِ دین سے نظری اتفاق باقی ہے لیکن عملی طور پر شل ہوگیا ہوں۔ شاید شیطان کا قابو چل گیا ہے۔ مقصدِ زندگی سے دھیما دھیما سا لگاؤ ہے لیکن ساتھ چلنے سے جی چُراتا اور کتراتا ہوں۔ صحت بہتر ہے لیکن طبیعت بے چین رہتی ہے۔ بتاؤ کیا کروں، کیا پڑھوں۔''

عزیز دوست! بعض اوقات کسی عزیز کی، مقصد زندگی کے ایسے انجام سے اس کی موت زیادہ خوش گوار محسوس ہونے لگتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ محاذِ جنگ سے مفرور ہونے سے پہلے وہ محاذِ جنگ پر کام آگیا ہوتا تو بہتر ہوتا۔ مجھے شدت سے کام لینے کا طعنہ نہ دینا۔ میرے نزدیک دین حق کی سربلندی کا جھنڈا اٹھانے کے بعد اسے پھینک دینا، بیٹھ جانا اور پیٹھ دکھانا موت سے بدتر انجام ہے۔

ایسا خوفناک خط تم مجھے نہ لکھتے تو شاید میں تمہاری طرف سے مطمئن رہتا اور سمجھتا کہ زندگی کے کارزار میں تم کسی نہ کسی محاذ پر ضرور مردانہ وار باطل کے خلاف چومکھی لڑائی لڑ رہے ہوگے لیکن تمہاری ان سطور نے تو کتنے ہی زخموں کے ٹانکے توڑ دیے ہیں۔ تم نے خط میں کاروباری کاموں کی کثرت اور معاشی جدوجہد کی مصروفیات کا رونا بھی بہت رویا ہے اور مجھے محسوس ہوا کہ غربتِ اسلام کے اس پُرمصائب دور میں اسلام کے غریب خادموں میں سے ایک خادم کو جیسے خوشحالی نے ڈس لیا ہے۔

دعا تو میں ضرور کرتا ہوں۔ باطل کے خلاف حمایتِ حق میں لڑنے والے ہر ساتھی کے لیے دعائیں کیا کرتا ہوں۔ لیکن دعا وہی کارگر ہوتی ہے جو انسان خود اپنے مالک سے قریب تر ہو کر، اُسے دردمندی سے پکار کر، اس کے سامنے اپنی ساری مجبوریاں، معذوریاں، کمزوریاں اور کوتاہیاں رکھ کر مدد کے لیے پکارتا ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سے بڑی دعا اور کیا ہوسکتی ہے۔ بس شرط یہی ہے کہ بندہ مدد مانگنے سے پہلے اپنی بندگی کو خالص کرکے اپنے مالک کے سامنے اسے عاجزانہ ہدیے کے طور پر پیش کرسکے۔

مادہ پرستی کی دوڑ میں مصروفیت کی سب سے پہلی چوٹ نماز پر ہی پڑتی ہے جو مالک سے قربت کی ڈیوڑھی ہے اور اس کے سامنے عاجزانہ حاضری میں مدد طلبی کی واحد صورت ہے۔ پھر نماز تو اس کا حکم ہے، البتہ مالک کے حکم کے علاوہ مزید اس کی بارگاہ میں عرض معروض کرنے سے جو اخلاص پیدا ہوتا ہے اس کا ذریعہ نوافل ہیں جس سے پتا چلے کہ بندہ اس در سے کچھ

مزید کا طالب ہے اور خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ ہو سکے تو الارم لگا کر رات کے پچھلے پہر اٹھو۔ چند دن ہی سہی، ڈیوٹی سمجھ کر ہی سہی، چاہے اپنے آپ پر جبر کر کے ہی سہی اور یہ سمجھو کہ حاکم سے ایک خاص کام پڑ گیا ہے اور اس کے دربار میں آسانی سے بازیابی کے لیے وہی وقت مقرر ہے۔ چھپ چھپا کر جب اس کے سامنے اظہارِ بندگی کیا جائے اور صرف اسی کو مخاطب اور متوجہ کر کے کیا جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی جائے کہ حاکمِ اعلیٰ تک اپروچ کا بندے نے ایک راستہ ڈھونڈ لیا ہے، تب دعا میں تاثیر بڑھ جاتی ہے اور اخلاص کا ثبوت ملتے ہی دعا بجلی کی سی سرعت سے آدمی کی ہستی سے اٹھ کر افلاک کی پہنائیوں میں سرایت کر جاتی ہے.... تو بھائی میرے! اگر مصروفیت نے پکڑ لیا ہے تو اس وقت مالک کے پاس عرض داشت لے کر پہنچو جب تمہارے شہر میں کوئی دوکان کھلی نہیں ہوتی اور کوئی کاروبار الجھانے کے لیے موجود نہیں ہوتا۔ اگر رغبت نہ ہو تو ابتداءً یہ کام جبر سے ہی کرو۔ درِ اجابت تو خود تمہارا دل ہے۔ اگر اسے سومنات کے مندر کی طرح بند رکھو گے۔ پھر اسے دوسرے کی دعائیں کیسے کھولیں گی۔ دوسرے تو زیادہ سے زیادہ اخلاصِ عمل کی دعا کر سکتے ہیں اور وہ بھی تب اثر کرتی ہے جب پودا زمین میں جڑ پکڑ چکا ہو۔ اگر جڑ ہی اکھڑی ہوئی ہو تو باہر کا پانی کوئی سرسبزی پیدا نہیں کر سکتا۔

ایک کام اور کرو۔ تمہارے محلے میں ایک ہسپتال ہے۔ کبھی کبھی وقت نکال کر ہسپتال میں مریضوں کی مزاج پُرسی کے لیے چلے جایا کرو۔ بیمار، ناتواں، مجروح، زندگی سے بیزار اور پریشان حال نحیف و نزار انسانوں سے جا کر ملو، ان سے تعارف حاصل کرو۔ روزانہ کم از کم تین مریضوں کی مزاج پُرسی کو آیا کرو۔ اسے چند دنوں کے لیے معمول بناؤ اور یہ سمجھو کہ مالک اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا بندہ اس کے دوسرے مصیبت زدہ بندوں سے ہمدردی کرے۔ اگر کبھی کسی مریض کو حقیقی حاجت مند پاؤ تو ہمت کر کے اس کی مدد بھی کر ڈالو۔ لیکن کراہت سے نہیں، خوش دلی سے۔ بس کبھی کبھی یہ محسوس کرنے کی کوشش کرنا کہ ان کے بجائے تم خود ہوتے تو تمہارا کیا حال ہوتا۔ تم کتنے دوسروں کی ہمدردی کے محتاج ہوتے۔ تم کتنے دوسروں کے ہمدردانہ الفاظ تک کے منتظر ہوتے۔ بس یہ سوچ کر خدا کے ان نحیف و نزار بندوں کی عیادت ضرور کر آیا کرو۔

اس کام کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا کام بھی کرنے کی ضرورت ہے۔ ہو سکے تو کبھی کبھار محلے کے قبرستان میں بھی ہو آیا کرو۔ وہاں بڑے بڑے کاروباری اپنا کاروبارِ حیات سمیٹ کر پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے مکانات تمہارے اپنے محلے میں ہیں جن کے گرنے یا کھڑے رہنے کی طرف سے وہ ایسے بے نیاز ہیں جیسے انھوں نے کبھی یہ بنائے ہی نہ تھے۔ ان کے کاروبار تمہاری بستی میں اب بھی چل رہے ہیں۔ لیکن جن کا گمان تھا کہ ان کے بغیر یہ کاروبار نہ چلیں گے، کاروبار چل رہے ہیں.... لیکن وہ کاروبار کے ساتھ نہ چل سکے جنھیں لمحہ بھر فرصت نہ ملتی تھی۔ اب انھیں تا قیامت فرصت ہی فرصت ہے۔ کاروبار سے بھی اور عمل سے بھی۔ اس لیے کہ دنیا کی امتحان گاہ میں یہی تو مقابلہ تھا کہ کاروبارِ دنیا کے اندر رہ کر عمل کیسے کیا جائے اور عمل کرتے ہوئے کاروبارِ دنیا کو کیسے نبھایا جائے۔ دونوں میں سے کوئی ایک بھی شے مطلوب نہ تھی۔ اگر ہوتی تو امتحان ہی کیوں ہوتا۔ امتحان تو تھا ہی اس مقابلے اور توازن میں۔ اس لیے چند دن اس شہرِ خموشاں کا علی الصبح یا سرِ شام دورہ رکھو۔ ان کی قبروں کا حال دیکھو۔ ان کے کتبے پڑھو۔ ان سے علیک سلیک کرو اور آخرت کی عدالت لگنے تک، عدالت کے احاطے میں ان کے صدیوں کے انتظار کا حال دیکھو۔ غور کرو کہ اس قطار میں کھڑے ہونے کے لیے ہم تم بھی قبرستان کے اس جمِ غفیر کی طرف رواں دواں چلے جا رہے ہیں۔ (کبھی اپنے کسی بھائی بند کا جنازہ پڑھتے ہوئے ہی یہ بات ذہن میں لے آؤ!)

فی الحال یہ تین کام کرو اور یہ حمیت وغیرت بھی اپنے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کرو کہ دشمن حق نے آخر تم ہی کو نرم چارہ سمجھ کر کیوں مقصدِ حیات سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ پھر وہ اتنا جری کیوں ہو گیا ہے کہ علی الاعلان تمھیں احساسِ شکست دلا رہا ہے کہ میں نے تم پر قابو پا لیا ہے۔ اس نے اگر تمھیں یہ احساس دلایا ہے کہ وہ تم پر قابو پا گیا ہے تو تم بھی اسے خم ٹھونک کر جواب دو کہ بندۂ مومن کو مفتوح کرنا کوئی کھیل نہیں ہے۔ فرعون و نمرود بھی جس مومن کی سطوت سے پناہ مانگیں اس پر چند اندیشہ ہائے دور دراز کا جال پھیلا کر قابو پانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

پڑھنے کے لیے قرآن میں قیامت اور احوالِ آخرت کے مقامات، حدیث میں کتاب الرقاق کا حصہ اور رسول اکرم ﷺ اور صحابہؓ کی سیرتوں

سے زیادہ موزوں چیز اور کوئی نہیں ہے۔ جنھوں نے یہ کام احسن طریقے پر پہلے کیا ہے، ان کی درخشاں زندگیاں ہی تھکے ہوئے راہیوں کے لیے نشانِ منزل کا کام دے سکتی ہیں۔ ہوسکے تو قرآن کے ۳۰ویں پارے میں قیامت کا حال بتانے اور لرزا دینے والی سورتیں پڑھو۔

خلفائے راشدین کے احوال پڑھو۔ یہ سمجھ کر پڑھو کہ اصل وہ تھے اور ہمیں انھی کی نقل کے مطابق اصل کام کرنا ہے۔ کاروبار انھوں نے بھی کیے تھے لیکن ترازو کے ایک پلڑے میں سامانِ دنیا ہوتا تو دوسرے میں خوفِ خدا۔ پیمانے کے ایک سرے پر کپڑا ناپا جاتا تو دوسرے سرے پر قبر کا کنارہ نظر آتا رہتا۔ ایک طرف ملکوں کی باگیں ان کے ہاتھ میں ہوتیں تو دوسری طرف رات کو ڈاڑھی ہاتھ میں پکڑے رو رہے ہوتے کہ اے دنیا مجھ سے دور ہوجا! مجھے فریب نہ دے، میں تجھے طلاق دے چکا۔ یہی تو وہ لوگ تھے جو زمین کا نمک تھے جن کی مثل گروہ تختۂ زمین پر کبھی وارد نہ ہوا۔ ہمیں انھی کے نقشِ قدم کی تلاش ہے۔ وہ نقشِ قدم مل جائے تو عزیز دوست، زندگی سونے کی کان سے زیادہ قیمتی اور ہر سانس، جواہرات سے زیادہ بیش بہا ہوجائے.....اور تم خوب جانتے ہو کہ وہ جس پارس سے چھو کر سونا بنے تھے وہ خود فریضۂ اقامت دین کے لیے اٹھنے سے پہلے اپنے دیس کا ملک التجار تھا۔ لیکن جب اپنے مالک سے زندگی کا سودا کیا تو روپیہ کمانے والے کاروبار سے دامن جھاڑ کر اٹھ گیا اور روپیہ بناتے بناتے انسان سازی کا کام شروع کر دیا۔ تم خود جانتے ہو کہ اس کے بنائے ہوئے انسان دنیا میں بے مثل ثابت ہوئے اور دنیا کا بہترین گروہ کہلائے ..... دائیں ہاتھ سے نوالا اٹھانے کی سنت تو آج ہر مسلمان کو یاد رہ گئی ہے لیکن شاید یہ سنت یاد نہیں رہی کہ سرورِ عالمؐ نے مالک کی راہ میں اپنی زندگی کا سارا سونا لگا دیا تھا اور اپنے پاس کھجور کے بوریئے کے سوا باقی کچھ نہیں رکھا تھا۔

دین حق سے دل و دماغ کا اتفاق اور دست و بازو کا فالج تو بہت بڑی بیماری ہے جس کا تم نے اپنے بارے میں ذکر کیا ہے۔ اسی نفاق نے تو ہماری ساری قومی زندگی کو بے جان بنا کر رکھ دیا ہے اور پوری ملت بھوسے کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔ جس کا جی چاہتا ہے ڈنڈا ہاتھ میں لیے اس پر سوار ہوجاتا ہے اور یہ اپنے قیمتی اصولوں پر نظری ایمان رکھتے ہوئے عملی طور پر ہر ہنٹر باز کے اشارے پر چلتی رہتی ہے اور بالعموم پشتِ بمنزل ہی چلتی ہے۔

تم بہت مایوس نظر آتے ہو۔ کہتے ہو برسوں بیت گئے ہیں لیکن اسلامی نظام نہیں آیا ہے۔ تمہاری یہ مایوسی بھی دراصل اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ تم نے چشمۂ بیم و رجا سے رشتہ کمزور کرلیا ہے۔ جس راہ پر چلنے کا دعویٰ تم لے کر چلے تھے وہاں حساب کتاب نہیں کیا جاتا کہ کب چلے اور کتنا چلے اور کہاں تک پہنچے، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس راستے پر جانا ہے وہ راستہ موجود ہے اور اس کی دی ہوئی ٹانگیں بھی ابھی موجود ہیں۔ وہ نہ رہیں گی تو گھٹنوں کے بل چلیں گے، پیٹ کے بل گھسٹیں گے اور اس سے بھی گزر گئے تو آنکھیں تو نشانِ منزل کو دیکھنے کے لیے موجود ہیں، وہ کبھی مایوس نہ لوٹیں گی۔

بھائی میرے! یہ تو سوچو کہ جس راہ پر چلنے کا عزم رکھتے ہو، اس راہ پر ایسے ایسے راہ رَو گزر چکے ہیں جنھوں نے اگر ۹۰۰ سال تک دعوتِ دین کا کام بے ثمر کیا ہے تو بھی مایوس نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ زمین کے مالک نے جیسی زمین دی تھی، مزارع نے اسی کی اندر ہل چلانا تھا۔ ہمارا کام تو اس کی زمین میں ہل چلاتے رہنا ہے۔ شورزمین میں کچھ پیداوار نہ ہوئی تو مالک خوب جانتا ہے کہ اس کے نوکر نے محنت کی یا نہیں کی اور فصل نہیں ہوئی تو اس میں کسان کی محنت کا قصور ہے یا زمین کے شور کا۔ تم نے خدا کے اس نیک بندے کا نام تو سنا ہی ہے جنھیں حضرت ایوبؑ کہتے ہیں۔ برسوں تک بیماری میں مبتلا رہنے اور بدترین تکلیف دہ حالات گزارنے کے بعد، جب انھیں کہا گیا کہ وہ اپنے مالک سے اپنی بیماری اور تکلیف کے لیے دعا کریں، تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے اپنے مالک سے شرم آتی ہے جس نے عمر بھر خوش و خرم اور خوش حال رکھا، اب ابتلا کے چند ایام پر ہی بے صبر ہو کر، میں اس کے احسانات کیسے بھول جاؤں۔ مالک خوب جانتا ہے کہ اس کا بندہ کس حال میں ہے، اور وہ اپنے بندے کے لیے کافی ہے۔ مالک کا شکر کرو کہ اس نے کامیابی کو اجر کا مدار نہیں قرار دیا بلکہ اجر کی ابتدا نیت سے کی اور مومن کی دل شکستگی پر اسے دوہرے اجر کی خوشخبری سنائی۔

تم نے ویتنام والوں کو دیکھا جو اپنے خدا سے کسی اجر کی توقع نہیں رکھتے تھے لیکن محض زمین کے ٹیلوں، باغوں، کھیتوں، کارخانوں اور جنگلوں

تک کے لیے پیہم لڑنے اور ہزار سال تک نسل در نسل لڑنے کا داعیہ رکھتے تھے۔ اگر نفس کا بندہ انسان درختوں، ٹیلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے لیے صدیوں تک لڑنے کا داعیہ رکھ سکتا ہے تو خدا کا بندہ مومن اپنے مالک کے لیے باطل کے خلاف زندگی بھر لڑنے اور کبھی نہ جھکنے کا عزم کیوں نہیں رکھ سکتا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بنی نوع انسان میں سے کفر کے حصے میں سونا اور اسلام کے حصے میں مٹی آئی ہے۔ اگر تم یہ کہو تو یہ احساسِ کمتری کا مظاہرہ کرو گے۔ میں تو یہ بات کہنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ مومن کو اپنی پوشیدہ قوتوں کا شعور نہیں ہے۔ جس روز وہ جاگے گا دنیا کے اندھیرے روپوش ہو جائیں گے۔

ذاتی تربیت اور اصلاح فرد کے بارے میں بھی تمہارے خیالات میں الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ سیاسی الجھاؤ سے ہٹ کر یکسوئی کے ساتھ اپنی اور عوام الناس کی تربیت کی جائے۔ پھر مثال دیتے ہو کہ ہمارے تربیت کردہ لوگوں کے مقابلے میں فلاں فلاں طریقے پر تربیت یافتہ لوگ تقویٰ اور پرہیزگاری کے معروف پیمانے سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ تم کس طرح پلٹ کر، پھر گزرے ہوئے راستوں پر بھٹک رہے ہو۔

تحریک اسلامی کے نزدیک ذاتی تربیت اور اصلاح فرد کا وہی طریقہ بہترین اور فطری ہے جو حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کے لیے استعمال فرمایا تھا۔ جو بھی آگے بڑھا اس کے اعتقاد و ایمان کی بنیادیں درست کر کے اسے بھی دعوتِ دین کے اسی کام میں لگا دیا گیا جس میں حضورؐ خود مصروف تھے، یعنی نظام باطل سے کشمکش۔ یہ کام ہی خود ایسی بھٹی ہے جو سونے کو کندن اور کندن کو پارس بنا دیتی ہے اور جو مال کھوٹا ہو اسے کاٹ کر الگ پھینک دیتی ہے۔ اس تربیت کے لیے علاحدہ کسی خانقاہ کی تعمیر اور اس کے نظام الاوقات مرتب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، نہ کسی چلہ کشی کی حاجت ہوتی ہے، جیسے صحابہ کرامؓ کو اس کی ضرورت نہ پڑی تھی۔

خانقاہی طریقہ تو نہایت خلوصِ نیت کے ساتھ ہی سہی، اس وقت مرتب ہوا جب ملوکیت نے مذہب کو سیاست بدر کر دیا اور مسلمانوں کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ مذہب سے آزاد ہو کر مذہب سے آزاد سیاست کے تحت چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی تنگ صورت حال میں جو نظامِ تربیت بھی بنے گا وہ ایک طرف انسانی زندگی کے بہت وسیع سیاسی دائرے کو چھوڑ کر بنایا جائے گا اور دوسری طرف انسانی زندگی کے لیے دیے ہوئے اسلام کے وسیع تر احکامات معطل ہو کر جب صرف عبادت اور اوراد و اشغال تک ہی محدود ہو جائیں گے تو اسی محدود دائرے میں انہماک و اشتعال بھی بڑھ جائے گا۔

بلاشبہ اس سے معروف رواجی متقیوں جیسی ہیئت ابھر آتی ہے اس لیے کہ اس مذہبی ہیئت کی تیاری، مذہب بلا سیاست کے طریقے سے ہوتی ہے۔ لیکن تربیت ہمہ پہلو اور ہمہ گیر نہ ہونے کے سبب زندگی دو رنگی، سہ رنگی بلکہ پیچرنگی تک ہو جاتی ہے اور عبادات و اوراد اور معروف شرعی ہیئت کے ساتھ ساتھ معاملات کی خرابی اور کردار کی کمزوری تک بیٹھ جاتی ہے، بلکہ لوگ منکرات تک میں مبتلا رہتے ہیں اور کوئی انقباض یا تضاد محسوس نہیں کرتے، چونکہ تربیت کا سانچہ ہمہ گیر نہیں بلکہ چند پہلو گیر بنا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے ایک معمار تو پوری عمارت بنانا جانتا ہو، چاہے معمار نہایت اعلیٰ نہ ہو اور دوسرا معمار صرف غسل خانہ ہی بنا سکتا ہو چاہے اس کا معیار اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو۔ اب ظاہر ہے انسانی زندگی کو تو پورے مکان کی ضرورت ہے۔ ایک غسل خانے میں تو ساری زندگی بسر نہیں کی جا سکتی۔ غسل خانے میں چاہے غسل وطہارت کے تمام شرعی آداب کا لحاظ رکھا گیا ہو، لیکن اس سے باہر تو زندگی نہ معلوم کن کن آلودگیوں میں ملوث ہوتی رہے گی۔ اس کشمکش سے علاحدہ کردار مکمل نہیں ادھورا بنتا ہے۔ اسلام نے اگر فرد کی اصلاح کا کوئی نظامِ تربیت مرتب کیا تھا تو اپنے غلبے کے لیے کیا تھا نہ کہ وہ باطل کے غلبے کو قائم رکھنے اور اسے دیانت دار کارکن فراہم کر کے، اس کی بنیادیں زیادہ مضبوط کرنے کے لیے کیا تھا۔

بھائی میرے! عملی پسپائی آدمی کو کہاں کہاں ذہنی پسپائی پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔ آج تم فرد کی اصلاح کے کسی ایسے طریقے کی تلاش میں ہو جو اسلامی بھی ہو اور نظام باطل اس سے ناراض بھی نہ ہو۔ سوچنے کا یہ ڈھنگ سخت بے چارگی کا آئینہ دار ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ ایسا کوئی اسلامی طریقہ ایجاد نہیں ہوا ہے جس پر باطل ناراض نہ ہو اور اگر کوئی ہے تو وہ ایجادِ بندہ کی قسم کا ہوگا۔ قرآن و سنت کے اسلام سے اسے کوئی قریبی تعلق نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اسلام تو اپنے وجود کے اندر ہی اپنی سلطنت کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ اس کے احکام نافذ ہوں۔ منظم فوجوں کا مطالبہ کرتا ہے

تا کہ باطل کے خلاف اس کا حکمِ جہاد پورا کیا جائے۔ پولیس کا مطالبہ کرتا ہے تا کہ اس کے قوانین کو نافذ و جاری کیا جائے اور اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کی تادیب کی جائے۔ عدالتوں کا مطالبہ کرتا ہے تا کہ اس کے قوانین کے مطابق مجرموں کو سزائیں دی جائیں اور اس کے الٰہی قوانین کے مطابق فیصلے ہوں۔ پھر وہ یہ تک کہتا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مشرک، ظالم اور فاسق ہیں۔ اب بتاؤ ایسا اسلام کہاں سے لاؤ گے جو ایسا فرد تیار کرے جس پر نظام باطل بھی پورا اعتماد کرے اور اس کی خدمات سے خوش اور مطمئن بھی ہو۔

تم جو طبیعت کی بے چینی کا تذکرہ کرتے ہو، تو دراصل یہ بے چینی راہِ مستقیم پر ڈگمگانے کا نتیجہ ہے۔ تمھیں شاید اسلام کا انقلابی اور ہمہ گیر تصور چھوڑ کر کسی عافیت کے گوشے کی تلاش ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ نظام باطل کی عمل داری میں مومن کے لیے کسی جگہ کوئی عافیت کا گوشہ نہیں پایا جاتا، جب تک وہ غلبۂ اسلام کے تصور سے ہی دست بردار نہ ہو جائے۔ دلوں کا اطمینان اللہ کے ذکر میں، اس کا کلمہ بلند کرنے کی جدوجہد میں اور اس کے دین کے نفاذ کے لیے سختیاں سہنے کے عزم میں ہی پایا جاتا ہے۔ خاطر جمع رکھو کہ دل کا اطمینان اور کسی جگہ بھی نہ ملے گا۔ دل کا اطمینان ابن زیاد کو نہیں، امام حسینؓ کو حاصل تھا۔ مامون کو نہیں، احمدؒ بن حنبل کو حاصل تھا۔ جہانگیر کو نہیں، مجدد الف ثانیؒ کو حاصل تھا۔ عیاش فاروق کو نہیں حسن البنا شہیدؒ کو حاصل تھا۔ یہ بات مجھ سے نہ پوچھو۔ امت مسلمہ کی اپنی تاریخ سے پوچھ لو اور دل کے اطمینان کی تلاش میں ان کوچوں کا رخ نہ کرو جہاں چمک دمک تو بہت ہے، دنیوی مال و متاع بھی بہت ہے لیکن اگر کوئی شے نہیں پائی جاتی ہے تو وہ یہی دل کا اطمینان ہے۔

اللہ تعالیٰ تمھیں حقیقی قلبی اطمینان عطا فرمائے۔

●●●

---

*

اسلام ہی وہ واحد نظام ہے جس میں انسان اس غلامی سے آزادی پاتا اور صحیح معنی میں آزاد ہوتا ہے، وہ سب انسانوں سے آزاد ہو کر افکار، نظام ہائے حیات، طریق ہائے زندگی، شرائع و قوانین، اقدار اور پیمانے صرف اللہ سے لیتا ہے، اس معاملے میں اس کا حال اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی طرح ہوتا ہے، اس طرح وہ اور دوسرے انسان بالکل برابر ہوتے ہیں، سب کے سب ایک ہی آقاء سے لو لگائے ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی کسی کو اپنا رب نہیں بناتا۔

*

قرآن اہل حق کو اس حق کی، جس پر وہ ہیں، حقیقت سے اور ان کے اعداء جس باطل پر ہیں، اس کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ کرتا ہے، یہی نہیں، ان کے اعداء ان کے خلاف جو سازشیں کرتے ہیں، ان کی حقیقت بیان کرتا ہے اور آخر میں وہ ان اعداء کی طبیعت، ان کے اخلاق، ان کے اعمال اور ان کی نیتوں کو امت مسلمہ کے سامنے شرح و بسط کے ساتھ رکھتا ہے تا کہ وہ اپنے اعداء کی حقیقت کو جان لیں اور وہ اپنے لیے علم و معرفت کے جن مظاہر کے مدعی ہیں، ان کا پردہ چاک کرتا ہے۔ مسلمانوں میں جو لوگ ان کے سلسلے میں فریب خوردہ ہیں، ان کے اعتماد کو پاش پاش کرتا ہے، انہیں ان کے حالات سے متنفر کرتا اور ان کی دسیسہ کاریوں کو بالکل عریاں کر کے ختم کر دیتا ہے تا کہ ان کی دسیسہ کاریوں سے کوئی شخص متاثر نہ ہو اور کسی پر ان کا روغن چڑھ نہ سکے۔

(سید قطب شہیدؒ)

کیا بھارت کے لوگ آزاد ہیں؟

حذیفہ جاوید

آزادی دنیا کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک اہم نعمت ہے۔اس کے بالمقابل غلامی، ذلت و مسکنت اور کمزوری ولاچاری کا ایک استعارہ ہے۔آزادی کی نعمت کا حصول ہر انسان کی فطرت کی آواز ہے۔وہ غلامی پر کبھی مطمئن نہیں رہ سکتا۔

البتہ یہاں پر یہ بات جاننا بہت ضروری ہے کہ غلامی دو طرح کی ہوتی ہے۔جسمانی اور ذہنی۔دنیا کی اقوام کو جسمانی طور پر طویل مدت تک غلام بنا کر رکھنا ناممکن ہے۔لیکن ذہن وفکر کی غلامی انتہائی خطرناک قسم کی ہوتی ہے۔ذہنی وفکری غلامی کے شکار افراد و اقوام کو یہ بات ازبر کرادی جاتی ہے کہ وہ آزاد ہیں جب کہ وہ بدترین ذہنی وفکری غلامی میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن انہیں احساس ہی نہیں ہونے دیا جاتا کہ وہ غلام ہیں۔ بنی نوع انسان اس وقت تک اپنے اعلی مقام کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی ذہنی وفکری غلامی سے بھی آزادی حاصل نہ کرلے اور پھر اپنی اس آزادی کو اپنے خالق کے احکام کے تابع کرلے۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم نے جب یہ اعلان کیا،"آدھی رات کو جب دنیا سوتی ہے، ہندوستان اپنی زندگی اور آزادی کے لیے بیدار ہوگا" تو کیا واقعی آزادی کا وہ وسیع تصور شمال کے سرسبز میدانوں سے گزر کر، صحراؤں اور سمندروں کے کناروں کو چھوتا ہوا جنوب میں واقع کنیا کماری تک اپنے معنی و مفہوم کے ساتھ پہنچ گیا جیسا کی وزیر اعظم کا مقصود تھا؟۔گزشتہ ۷ دہائیوں پر مبنی ہمارے ملک کی آزادی کا ایک سرسری جائزہ لینے والا ایک ادنیٰ شہری بھی اسکے لیے اپنی گردن نفی میں ہلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ہندوستان نے بلاشبہ ۱۹۴۷ء میں انگریزی استبداد سے آزادی حاصل کرلی ہو، لیکن یہاں کے باشندے اب بھی آزادی کے اُس حقیقی مفہوم سے نا آشنا ہی ہیں۔آزادی اگر صرف بیرونی طاقتوں کے غلبے سے نجات کا نام ہے تو بے شک ہم آزاد ہیں،لیکن ایسی آزادی کا انسان کی زندگی پر شاید ہی کوئی نقش مرتب ہوتا ہوگا۔انسان کی روزمرہ کے معمولات کے جتنے بھی زاویے ہیں تقریباً ہر زاویے میں غلامی کا احساس آج بھی جوں کا توں باقی ہے۔

ہم اپنے قرب وجوار کا جائزہ لیں تو ہر میدان میں عوام الناس کسی نہ کسی صورت میں غلام رہنے پر مجبور ہیں۔ایک انسان یا اجتماعیت اگر غلام ہے اور وہ اپنی غلامی کا احساس کرتی ہے اور اس غلامی کو آزادی سے بدلنا چاہتی ہے تو یقیناً وہ فرد اور جماعت زندہ ہے ورنہ اگر کوئی اپنی غلامی کو ہی آزادی سمجھ بیٹھے تو کائنات کی کوئی طاقت اُسے آزاد نہیں کرا سکتی۔غرض یہ کہ اندرون سے بیرون تک جہاں جہاں بھی آزادی ہماری منتظر ہے، ہر جگہ ہم غلامی کو ہر دلعزیز بنائے بیٹھے ہیں۔ایسی غلامی خوف، بزدلی، منافقت اور بے ایمانی کا پیش خیمہ ہے۔

فکری غلامی

یہ مسلمہ حقیقت ہے کی حقیقی آزادی کے لیے فکر کی آزادی انتہائی ضروری ہے۔بھارت کا ایک بہت بڑا طبقہ جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ

ذہنی غلامی کا شکار ہو کر اپنی ذلت وخواری پر قانع ہو چکا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے ہم دلت اور پچھڑے طبقے کے نام سے جانتے ہیں۔ ہندوستان میں افکار کی یہ جنگ آج بھی جاری ہے۔ اس جنگ سے یہ بات بہت واضح ہے کہ جو قوم فکری طور پر مغلوب ہو جاتی ہے وہ آزادی کا احساس کبھی نہیں کر سکتی۔ آج ہندوستان سرمایہ داری، فسطائی ہندوتوا اور اسلامی افکار کے مابین جنگ کا کھلا میدان ہے۔ چونکہ افکار کی جنگ میں سیاسی غلبہ ایک موثر طاقت ثابت ہوتا ہے اس بنا پر ہر اُس محاذ پر ہندوتوا کے علمبرداروں نے فکری بالادستی قائم کرنے کی منظّم کوشش رواں رکھی ہے جہاں سے ہندوتوا فکر کی آسانی سے عوام میں رسائی ہو سکے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک رونما ہونے والے واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ کس طرح سے پے در پے اسلامی شعائر خصوصاً بابری مسجد، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات، قرآن اور دیگر اسلامی اصولوں پر منظّم طریقے سے حملے کر کے اسلامی فکر کے تئیں بے چینی کی کیفیت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش جاری ہے۔

سیاسی غلامی

سیاسی طور پر عوام کو غلام بنانا اور بنائے رکھنا طاقت ور افراد کا قدیم شعار رہا ہے۔ لیکن ایسی غلامی کو انسان کبھی بھی برداشت نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستانی عوام نے محاذ کھڑا کیا۔ لیکن اس کے بعد جب سیاسی لگام خود ہندوستانی سرمایہ داروں کے پاس آئی تو بہت احسن طریقے سے انہوں نے عوام کو کبھی حکومت سازی میں حصے داری کے نام پر، کبھی الیکشن کے نام پر تو کبھی آزاد انتخاب کی لالچ میں غلام بنائے رکھا۔ جتنا زیادہ حصہ عوام نے سیاست میں لیا ہے، تاریخ گواہ ہے کہ اتنا ہی زیادہ خود کا نقصان کیا ہے۔ ہر ۵ سال کے بعد عوام کو ایک نیا مدعا دے دیا جاتا ہے اور وہ اس میں پہلے سے زیادہ منہمک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح عوام خود کے گلے میں پڑے سیاسی غلامی کے طوق کو مضبوط سے مضبوط تر کرتی چلی جاتی ہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک عوام نے کثرت سے سرمایہ دار طبقے کی شہرت کی بھوک کو بحسن خوبی مٹایا ہے۔ آج سیاسی غلامی کا عالم یہ ہے کہ معاشرے میں جو جتنا جعل ساز اور عیار ہوتا ہے، عوام اُسے اپنا رہنما اتنی ہی خوش دلی سے مان لیتی ہے۔ کبھی ایک پارٹی کے خوشنما نعروں کے جال میں پھنستی ہے تو کبھی کسی کی نفرت انگیز بیان پر بھڑک اٹھتی ہے اور خود کے گھر کو آگ کے حوالے کر دیتی ہے اور انسانوں کی بستی بھیڑیوں کی بستی میں بدل جاتی ہے۔ ایک طرف سیاسی کھلاڑیوں کی بھوک ہر الیکشن میں نئی شکل میں سامنے آتی ہے لیکن وہ عوام جو اس نظام کو اپنی آزادی کا پرتو سمجھتی ہے اس کے مسائل پہلے سے زیادہ سنگین ہوتے جاتے ہیں لیکن اسے اپنی غلامی کا شعور تک نہیں ہوتا۔

اقتصادی غلامی

دولت اگر چند ہاتھوں کی زینت بنے گی تو یقیناً عوام کو اقتصادی غلامی کا سامنا کرنا پڑیگا۔ انگریز ہندوستان میں وہی سرمایہ دارانہ سوچ لے کر حاضر ہوئے تھے جو ہندو قوم کے طبقاتی نظام کو مضبوطی فراہم کرتا تھا۔ یہی وجہ رہی کہ سفید فام انگریزوں کی تو مخالفت کی گئی لیکن اسکے برعکس اُسی جدید سرمایہ دارانہ سوچ کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا جس کی انگریز وکالت کرتا تھا کیونکہ اس سے مال چند بینک کھاتوں کی زینت بنتا تھا۔ یہی وہ سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے عوام کی جیبوں تک اور بالآخر گھر کے پکوان تک رسائی حاصل ہوئی۔ گزشتہ ۷ دہائیوں میں اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے بڑھتی مہنگائی اور بیروزگاری، ایک کے بعد ایک اضافی ٹیکس، اور ہر سال بڑھتی ہوئی Below Poverty Line (BPL) کی شرح ہی کافی ہے۔ ماضی کے مقابلے میں سودی لین دین کرنے والے ساہوکار اگرچہ کم ہوئے ہوں لیکن اُن سے زیادہ منظّم اور مضبوط طریقے سے سودی نظام کو پروان چڑھانے کے لیے موجودہ بینکوں کا نظام ہندوستانی عوام کو معاشی غلام بنانے کے لیے بالکل کافی ہے۔

معاشرتی غلامی

اگر معاشرتی آزادی کو آزادی کا اصل پیمانہ تسلیم کیا جائے تو یہ بات کہنے میں کسی کو عار نہیں کہ ہندوستان صدیوں سے غلام ہے اور آج بھی اُسی غلامی کے طوق میں پہلے سے مضبوطی کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔ سماج اگر آپسی خیر خواہی اور دل جوئی کے جذبے سے سرشار نہ ہو تو معاشرتی سطح پر بگاڑ لاتا ہے اور پھر یہی بگاڑ ایک دوسرے پر فوقیت کی طرف ابھارتا ہے۔ ہندوستان میں افسوس ناک پہلو یہ ہے کی اکثریتی طبقے کا اصل الاصول ہی اونچ نیچ اور تفریق ہے۔ کوئی اُس وقت تک دھارمک ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ

اونچ نیچ کے اصول کو اُسی طرح نہ تسلیم کرے جیسا کہ وہ ہندو مذہب میں ہیں۔ ایسے میں بالائی طبقہ خود سر ہو جاتا ہے اور نچلے طبقوں پر کمر توڑ مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں شودروں پر ڈھائے جانے والے مظالم معاشرتی غلامی کی داستان بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حکومتی سطح پر ریزرویشن مہیا کرنے کے بعد بھی ہندوستان کے نچلے طبقے میں معاشرتی غلامی کے آثار زائل نہیں ہوئے۔

علاقائی اور لسانی غلامی

ہندوستان شاید ایسا واحد ملک ہے جہاں ہر ۲۰ کلومیٹر پر زبان، رہن سہن اور ماحول تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسے میں لوگوں کو باہم مربوط رکھنے کے لیے مختلف جغرافیائی حدوں کو واضح کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، لیکن جب ان حدوں کو انسان افضل یا کمتر کا معیار سمجھنے لگے تو علاقائی اور لسانی غلامی وجود میں آتی ہے۔ جس طرح حکومتی سطح پر ہندی کو عام کرنے سے جنوب میں جو کشیدگی پیدا ہوئی وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اُردُو اور ہندی کے مابین جو کشمکش ہے وہ اب کتابوں کے پنّوں سے نکل کر ایک دوسرے کی رقابت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسے میں اُردُو یا دیگر علاقائی زبان اختیار کرنے والے افراد معاشرے میں پریشانی کا شکار ہو رہے ہیں، جو اُن کی ذہنی اضمحلال کی طرف اشارہ دے رہا ہے۔ آزادی کے بعد سے ہندی اور اُردُو زبان کو اکثریت اور اقلیت میں بانٹنے کی پُرزور کوشش جاری ہے، جس کی زد راست طور پر اقلیت کی شناخت پر پڑ رہی ہے۔ اُردُو کی مقبولیت میں منصوبہ بند طریقے سے گراوٹ عنقریب ایک خاص طبقے کو ذہنی طور پر غلام بنانے کی باضابطہ منصوبہ بندی محسوس ہوتی ہے۔

نفسیاتی غلامی

اصل غلام وہ ہے جو نفسیاتی سطح پر غالب قوم کی غلامی کو برضا و رغبت قبول کر لے۔ ہندوستان میں جتنی بھی شکلیں غلامی کی موجود ہیں اُن سب کا اصل مقصد اسی نفسیاتی غلام عوام کو پیدا کرنا ہے جو فرماں روا کے ہر حکم کو دل کی گہرائیوں سے امتاو صدقنا کہنے کے لیے ہر لمحہ تیار ہو۔

بقول علامہ اقبال:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

آج ہندوستانی عوام کے درمیان ایسی بہت سی چیزیں رائج ہیں جو زمانہ قریب میں شاید ہی وہ اپنے درمیان گوارا کرتی لیکن ضمیر کی بتدریج تبدیلی نے آج انہی چیزوں کو مرغوب و محبوب بنا دیا ہے۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کے درمیان گائے کی قربانی، بابری مسجد کی شرعی حیثیت، یوگا اور سوریا نمسکار کو لیکر جو علمی اور عملی اقدامات دیکھنے میں آتے ہیں وہ اسی نفسیاتی غلامی کے دائرے میں شامل ہیں۔ حکومت کے ذریعے عوام کو مفلوج کرنے کے لیے جو منصوبہ بند اقدامات کا سلسلہ آزادی کے بعد سے شروع ہوا وہ اب تک تھمنے کا نام نہیں لے رہا۔ تعلیمی نصاب میں باقاعدہ ہندوتوا کی فکر کو پروان چڑھانے کی جو کوشش کی گئی اسکا پھل آج اکثریتی طبقے کے نازیبا اشتعال انگیز بیانات اور اقدامات سے واضح ہے۔ ۱۹۴۷ء سے شروع ہونے والے منصوبہ بند فسادات کا سلسلہ ۷۰ سال سے اُسی طرز پر جاری ہے۔ ایسے میں جہاں اقتصادی طور پر اقلیت کو کمزور کیا گیا وہیں دوسری جانب اُن کے درمیان عدم اعتماد کو پروان چڑھایا گیا۔ سوشل میڈیا کے ذریعے ایسے عناصر کو فروغ دیا گیا جو اقلیتی طبقے کے خلاف اشتعال انگیز بیانات دے سکیں اور اُن پر کوئی گرفت بھی نہ ہو۔ بابری مسجد کے سلسلے میں عدلیہ کے کردار نے مسلمانوں میں ایک بے چینی کی فضا کو پروان چڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ میڈیا ٹرائلز گزشتہ 3 دہائیوں سے بدستور جاری ہے۔ کشمیر کی داستان اپنے آپ میں ایک مکمل باب ہے کہ اُس وادی کے باشندوں کو غلام بنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ اور جھارکھنڈ میں آدی باسی طبقے کے ساتھ چل رہی کشمکش آج بھی اپنے انجام کو نہیں پہنچی۔ غرض یہ کہ ایسے اقدامات کی فہرست بہت طویل ہے کہ کس طرح جبر و استبداد کے ذریعے عوام کو بار بار غلام بنایا گیا۔ آزادی کے دن خوشیاں منانے والے ذرا غور کریں کہ وہ حقیقت میں اپنی آزادی کی خوشی منا رہے ہیں یا اپنی غلامی کا جشن منا رہے ہیں۔ امت مسلمہ کا حصہ ہونے کے ناطے بھارت کے مسلمان اس دن کو یوم احتساب کے طور پر منائیں، نیز یہاں کی آبادی کے سامنے واضح کریں کہ وہ کس کس طرح سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن زنجیر پہنا کر ان سے رقص کروایا جاتا ہے۔ یہاں کے باشندوں کو بتانا ہوگا کہ حقیقی آزادی خالق کائنات کی صحیح پہچان اور اس کے احکام کے تابع رہنے میں ہے۔

●●●

سفر ہجرت اور صحابیات

ثمرہ یعقوب فلاحی

ہجرت معروف معنوں میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک دین کی حفاظت اور ایمان کی سلامتی کی خاطر سفر کرنے کو کہتے ہیں۔ عہد نبوی میں دو ہجرتیں مشہور ہیں۔ ہجرت حبشہ اور ہجرت مدینہ۔ ہجرت حبشہ دو دفعہ پیش آئی جب کہ ہجرت مدینہ صرف ایک دفعہ۔ ہجرت قربانی کی ایک عظیم ترین صورت ہے۔ ایک فرد اپنے محبوب خاندان، گاؤں، علاقہ اور ملک چھوڑ کر رب ذوالجلال کے لئے ایک ایسی دنیا کا سفر کرتا ہے جس کے بارے میں اس کو کسی قسم کا تجربہ نہیں ہوتا۔ وہاں کے لوگ اس کے لئے اجنبی ہوتے ہیں، سارا معاشرہ اس کے لئے نیا ہوتا ہے لیکن خدا کی رضا کے لئے وہ یہ ساری مشکلات برداشت کرتا ہے۔ یقیناً ہجرت ایک مضبوط ایمان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

جب ہم عہد نبوی کی ہجرتوں کو دیکھتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین صحابیات نے بھی ایمان کی سلامتی کے لئے اس راہ وفاء کو اختیار کیا اور اس راہ کی تمام مشکلات کو برداشت کیا۔ عہد مکی میں جور وستم کا آغاز چوتھے سال کے درمیان یا آخر میں شروع ہوا تھا۔ ابتداء سختیاں کم تھیں لیکن دھیرے دھیرے یہ بڑھتی چلی گئیں یہاں تک پانچویں سال تک اپنے شباب کو پہنچ گئیں اور مسلمانوں کے لیے ایمان بچانا مشکل نظر آنے لگا۔ اس مشکل وقت میں قرآن نازل ہو رہا تھا جس میں اہل ایمان کو واضح اشارات دیے گئے کہ اللہ کی زمین وسیع ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ اصحمہ نجاشی شاہ حبش ایک عادل بادشاہ ہے، وہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے ایمان کی سلامتی کی خاطر حبشہ ہجرت کر جائیں۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق رجب 5 نبوی میں صحابہ کے پہلے گروہ نے ہجرت کی۔ اس گروہ میں بارہ مرد اور چار خواتین بھی تھیں۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ انکے امیر تھے جن کے ہمراہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ بھی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے بعد یہ پہلا گھرانہ ہے جس نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔

پہلی کامیاب ہجرت حبشہ سے کفار مکہ کا ظلم مسلمانوں پر اور بڑھ گیا۔ مجبوراً آپ ﷺ نے صحابہ کو پھر ہجرت حبشہ کا مشورہ دیا۔ آپؐ کے مشورے کی تعمیل میں اس دفعہ 82 مردوں اور 18 خواتین نے ہجرت کی۔ صنف نازک ہونے کے باوجود کسی خاتون صحابیہ کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہ آئی۔

مہاجر خواتین میں ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا بھی تھیں جنہوں نے اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ ہجرت کی تھی۔ عبید اللہ بن جحش وہاں جا کر مرتد ہو گئے اور عیسائیت اختیار کر لی اور وہیں انتقال کر گئے۔ لیکن ام حبیبہ اپنے دین اور اپنی ہجرت پر قائم رہیں۔ بعد میں آپؓ حضور پاکؐ کی زوجیت میں آ گئیں۔

عہد نبوی کی سب سے بڑی ہجرت، ہجرت مدینہ ہے جس کا حکم تمام اہل ایمان مرد و خواتین کو دیا گیا تھا۔ جن جن مصائب و مشکلات سے مرد حضرات دوچار ہوئے ان سب آلام سے خواتین بھی دوچار ہوئیں۔

سب سے پہلے مہاجر حضرت ابوسلمہ تھے۔ انکی ہجرت کا واقعہ بڑا دردناک ہے۔ ہجرت کے سفر

میں انکے ہمراہ انکے بیوی بچے بھی تھے۔ جب انہوں نے روانہ ہونا چاہا تو ان کے سسرال والے سامنے آگئے اور ان سے انکی بیوی کو چھین لیا۔اس پر ابوسلمہ کے گھر والوں کو تاؤ آگیا اور انکی بیوی ام سلمہ سے انکے بچے کو چھین لیا۔ چھینا جھپٹی میں بچے کا ہاتھ تک اکھڑ گیا اور ابوسلمہ کے گھر والے اس کو اپنے پاس لے گئے۔ ابوسلمہ نے تنہا مدینہ کا سفر کیا۔اس کے بعد ام سلمہ کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی روانگی اور اپنے بچے سے محرومی کے بعد روزانہ صبح صبح ابطح (جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا) پہنچ جاتیں اور شام تک روتی رہتیں۔ اسی حالت میں ایک سال گذر گیا۔ بالآخر ان کے گھرانے کے کسی آدمی کو ترس آگیا اور اس نے کہا کہ اس بیچاری کو کیوں نہیں جانے دیتے؟ اسے خواہ مخواہ اس کے شوہر اور بیٹے سے جدا کر رکھا ہے۔اس پر ام سلمہ سے ان کے گھر والوں نے کہا کہ اگر تم چاہو تو اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ۔حضرت ام سلمہ نے بیٹے کو اس کے ددھیال والوں سے واپس لیا اور مدینہ چل پڑیں۔اللہ اکبر! پانچ سو کلو میٹر کی مسافت کا سفر اور ساتھ میں کوئی مخلوق نہیں۔جب تنعیم نامی ایک مقام پر پہنچیں تو عثمان بن طلحہ مل گئے۔انہوں نے قباء کی بستی تک پہنچا دیا اور کہا کہ اسی بستی میں تمہارا شوہر ہے، چلی جاؤ۔ اس طرح کے واقعات سیرت میں کئی ایک مل جائیں گے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابیات نے دین کی خاطر سفر ہجرت جیسی مشکل منزل کو کس طرح پار کیا۔

ہجرت مدینہ کے باب میں نبی آخر الزماںؐ کی ہجرت سب سے زیادہ سبق آموز اور اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ایسا سفر تھا جس میں قدم قدم پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے آپ کو تلاش کر رہے تھے لیکن آپ ﷺ کی کامیاب حکمت عملی اور نصرت خداوندی نے کفار کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔اس سفر میں دو مواقع پر حضرت اسماء بنت ابی بکر کی ذہانت اور نبوی تربیت نے اہم رول ادا کیا۔

جب کفار مکہ نے صبح آپ کو نہیں پایا تو غصے میں ابوجہل حضرت ابوبکر صدیق کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو حضرت اسماء نے دروازہ کھولا۔ابوجہل نے ان سے ان کے والد اور آپؐ کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نفی میں جواب دیا تو کمبخت ابوجہل نے اس زور کا تھپڑ مارا کہ ان کے کان کی بالی گر گئی لیکن دشمن خدا کچھ بھی معلوم کرنے میں ناکام رہا۔غار ثور میں منصوبہ کے مطابق تین دن قیام کے بعد مدینہ روانگی کا وقت آیا تو اسماء بنت ابی بکر زاد سفر لے کر آئیں مگر اس میں لٹکانے والا بندھن بھول گئیں۔جب روانگی کا وقت آیا اور حضرت اسماء نے توشہ لٹکانا چاہا تو تو دیکھا کہ اس میں بندھن ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنا پٹکا (کمر بند) کھولا اور دو حصوں میں چاک کر کے ایک میں توشہ لٹکا دیا اور دوسرا کمر میں باندھ لیا۔اسی وجہ سے ان کا لقب ذات النطاقین پڑ گیا۔

غور کیا جائے تو یہ ایسا وقت تھا جہاں ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا۔ ذرا سے بے احتیاطی کے سنگین نتائج برآمد ہوتے لیکن ایسے شدید ترین حالات میں بھی ایک خاتون نے اعصاب پر کنٹرول اور ایمان و استقامت کا ثبوت دے کر قیامت تک امت مسلمہ کی خواتین کے لئے نمونہ قائم کیا۔مسلم خواتین اصلاحی کوششوں کے ساتھ ساتھ نظام باطل پر ضرب لگانے اور غلبہ اسلام کی عملی جدوجہد اور جہادی کوششوں میں بھی فعال کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اسلامی تاریخ ایسی بہادر اور جانباز خواتین سے بھری پڑی ہے۔

●●●

فارم نمبر چار (Form (4

مالک : شیخ نثار شیخ چاند

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پہلا منزلہ بسیرا اپارٹمنٹ کے سامنے سبھاش چوک آکولہ۔

پرنٹر : شیخ نثار شیخ چاند

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پہلا منزلہ بسیرا اپارٹمنٹ کے سامنے سبھاش چوک آکولہ۔

ایڈیٹر : شیخ نثار شیخ چاند

قومیت : ہندوستانی

پتہ : پہلا منزلہ بسیرا اپارٹمنٹ کے سامنے سبھاش چوک آکولہ۔

وقفہ اشاعت : ماہانہ

مقام اشاعت: پہلا منزلہ بسیرا اپارٹمنٹ کے سامنے سبھاش چوک آکولہ۔

میں پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر شیخ نثار شیخ چاند اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم کے مطابق بالکل صحیح ہیں۔

دستخط : شیخ نثار شیخ چاند

☼☼☼

اچھے بچے ایسا کام نہیں کرتے ہیں

جاوید اقبال

احسن کے امتحانات ختم ہو گئے تھے۔اس کے ابو اسے اپنے دوست کے گھر لے گئے، وہاں احسن نے ان لوگوں کی چیزوں کو چھیڑنا شروع کر دیا تھا۔

"محمود انکل! یہ گھر تو بہت خوبصورت ہے۔ یہ آپ نے کہاں سے لیا ہے؟" احسن نے شیشے کا بنا ہوا چھوٹا سا گھر اٹھانے کے بعد کہا۔"بیٹا جب میں اٹلی گیا تھا،تب میں وہاں سے یہ لے کر آیا تھا۔" محمود صاحب نے احسن کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔کچھ دیر بعد احسن نے گھر میز پر رکھ دیا تھا اور پھر اس کا دھیان دوسری چیزوں کی جانب چلا گیا تھا۔

"یہ گلدان بھی بہت حسین ہے۔" احسن نے شیشے کا گھر میز پر رکھنے کے بعد گلدان اٹھا لیا تھا۔" احسن بیٹا! چیزوں کو یوں اُٹھاتے نہیں ہیں۔ یہ کھیلنے کی چیز نہیں ہے،ٹوٹ جائے گا۔احسن کے ابو فارس صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔"بابا جان یہ مجھے بہت اچھا لگا ہے۔تھوڑی دیر بعد اسے اس جگہ پر رکھ دوں گا۔" احسن کی بات سننے کے بعد اس کے ابو کو بہت افسوس ہوا کہ ان کے بیٹے نے ان کی بات نہیں مانی۔جب وہ دونوں گھر واپس آ گئے،تب احسن نے محسوس کیا کہ ابو اس سے زیادہ بات نہیں کر رہے ہیں۔

"بابا جان کیا آپ ناراض ہیں؟" احسن نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! جب کسی کے گھر جاتے ہیں تو ان لوگوں کی چیزوں کو اٹھا کر دیکھنا اچھی بات نہیں ہوتی ہے۔سب یہی کہیں گے کہ احسن اچھا بچہ نہیں ہے،بہت شرارتی ہے۔آپ کو میں نے ایسا کرنے سے منع بھی کیا لیکن آپ نے میرا کہنا نہیں مانا۔مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہوا ہے۔" احسن کے بابا جان نے اسے وہ بات بتا دی تھی،جس کی وجہ سے وہ خفا ہوئے تھے۔

"بابا جان آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔اس بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔آپ نے مجھے بہت پیاری بات بتائی ہے۔پھر کبھی آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" احسن نے جو کہا تھا وہ کر کے بھی دکھایا۔اس کے بعد وہ جب بھی اپنے بابا جان کے ساتھ کسی کے گھر جاتا تو دوسروں کی چیزوں کو بس دور سے ہی دیکھ لیتا تھا۔

پیارے بچو! اس کہانی سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ کسی کی چیزوں کو اٹھانا اور پھر کھلونا بنا کر کھیلنا بری بات ہے۔چیزیں گر کر ٹوٹ سکتی ہیں اور اس طرح دوسروں کا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔اچھے بچے ایسا کام نہیں کرتے ہیں۔

●●●

میری کتاب

جاوید اقبال

سورج کی پہلی کرن کمرے میں داخل ہوئی تو علی کی آنکھ کھل گئی اور وہ بستر سے چھلانگ لگا کر اُٹھا، کیوں کہ آج اسکول کی چھٹی تھی۔ سوچا، گھر بیٹھے کیا کیا جائے۔ ناشتے کے بعد باہر کھیل کود کا پروگرام بنالیا۔

ٹوپی اُٹھائی اور بلّا ہاتھ میں لے کر کھیلنے کے لیے باہر جانے کی تیاری کی۔ ابھی ٹوپی سر پر رکھنے ہی والا تھا کہ پاس ہی سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا کوئی نظر نہ آیا لیکن آواز برابر آتی رہی۔ اچانک کتابوں کے شیلف (SHELF) پر سے ایک بوسیدہ کتاب گری۔

علی نے حیرت سے دیکھا تو کتاب نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

"میاں! دیکھتے کیا ہو، ہاتھ پکڑ کر سہارا دو۔"

علی حیران رہ گیا اور ہاتھ بڑھا کر کتاب اُٹھائی۔ پرانی کتاب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا:

"میاں! میری زندگی کے چند روز باقی ہیں۔ اس کے بعد مجھے ردی میں بیچ دیا جائے گا اور نہ جانے میرا وہاں کیا حال ہو گا۔ میں نے بہت سے لوگوں کو علم کی روشنی سے منور کیا ہے لیکن افسوس کہ آج میری بوسیدہ حالت کو کوئی سہارا دینے والا نہیں۔ دیکھا جائے تو مجھ میں کیا نہیں ہے۔ انسائیکلو پیڈیا نام ہے میرا، لیکن پرانی ہونے کی وجہ سے میری کوئی قدر نہیں ہے۔ میاں! اب تو کمپیوٹر اور ٹی وی نے بچوں کا دھیان بالکل ہم پر سے ہٹا دیا ہے۔"

یہ کہہ کر کتاب زار و قطار رونے لگی۔ علی کو بہت افسوس ہوا اس نے سوچا کہ اگر ہم اپنی پرانی کتابوں کو درست حالت میں رکھیں تو ہمارے بعد اور بھی لوگ انھیں ضرورت کے وقت پڑھ سکتے ہیں۔

علی نے فوراً کتاب اُٹھائی اور جلد ساز کے پاس پہنچا۔ جلد ساز کے پاس اور بھی بوسیدہ کتابیں اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔

جلد ساز نے علی کو دو دن کے بعد آنے کو کہا۔ دو دن گزر گئے علی جلد ساز کے پاس گیا اور دیکھا کہ دکان پر کئی نئی کتابیں رکھی ہیں۔

ان ہی کتابوں میں سے سیٹی کی آواز آئی اور ایک نئی کتاب نے علی کو اشارہ کیا:

"پہچانا اے دوست! میں وہی انسائیکلو پیڈیا ہوں، جسے تم پرانی حالت میں چھوڑ گئے تھے۔ تمھارے توجہ اور جلد ساز کی محنت سے آج مجھے نئی زندگی ملی ہے۔ اب میں نئی صورت میں ہوں اور میری چمک دمک واپس آگئی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب میں کارگر ہوگئی ہوں، مزید علم بانٹ سکتی ہوں۔"

علی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا اور جھٹ سے کتاب کو سینے سے لگا لیا۔ جلد ساز کا شکریہ ادا کیا اور اس کی اُجرت ادا کی۔ اب علی کے پاس ہر کتاب نئی تھی، کیوں کہ وہ کتابوں کی حفاظت اور ان سے محبت کرنا سیکھ گیا تھا۔

●●●

تحریک اسلامی کے معترض

ماہر القادری

کچھ صاحبانِ جبہ و دستار و دلق ہیں
جو اپنے آستانوں پہ 'معبودِ خلق' ہیں

معنی:

دلق: گدڑی، اون کا لباس جو درویش پہنتے ہیں۔

تشریح:

غلبۂ دین کی راہ سے کنارہ کش ہونے والوں میں مسندوں پر بیٹھے ہوئے علماء اور خانقاہوں کے درویش بھی ہیں، جو خدا کی مخلوق پر اپنے مقام و مرتبہ کے ذریعہ رعب جماتے اور اپنے تابع رکھتے ہیں۔

کچھ اس غرور میں ہیں کہ ہم اہلِ ذکر ہیں
آگاہِ سترِ دین ہیں، اربابِ فکر ہیں!

معنی:

ذکر: بیان، خدا کی یاد، ستر: چھپانا، پردہ، اربابِ فکر: غور وفکر کرنے والے لوگ۔

تشریح:

ایک طبقہ اس بات کا مدعی ہے کہ وہ قرآن وسنت کا تذکرہ کرنے والے اور خدا کے ذکر میں منہمک رہنے والے ہیں، دین کے نشیب وفراز اور ظاہر و باطن کو سمجھنے والے اور اس میں غور وفکر کرنے والے ہیں۔

ہمت تراش ان میں ہیں اور کچھ ہیں بے یقیں
کچھ فطرتاً شریر ہیں، کچھ ہیں مذبذبیں

معنی:

ہمت تراش: ہمت بڑھانے والے، مذبذبیں: ایک خیال پر قائم نہ رہنے والے، ڈانواں ڈول۔

تشریح:

کچھ مخالفین تحریک ایک دوسرے کی ہمتیں بڑھانے کا کام کرتے ہیں اور کچھ اس طرف سے شک و شبہ کا شکار ہیں۔ کچھ اپنی فطری کجی اور شرارت کی وجہ سے مخالفت پر آمادہ ہیں، تو کچھ دونوں افکار کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں کہ کس طرف جائیں۔

کچھ چاہتے ہیں صرف دعاؤں سے انقلاب
کچھ کھا رہے ہیں آپ ہی بے وجہ پیچ و تاب
جو چاہتے ہیں راہ میں بکھرے ہوئے ہوں پھول
وہ آزمائشوں کے تصور سے ہیں ملول

معنی: ملول: اداس، غمگین۔

تشریح:

کچھ لوگ جد و جہد کے بجائے محض دعاؤں اور عبادات کو ہی غلبۂ دین اور انقلاب کا طریقۂ کار سمجھتے ہیں، اور ایسے لوگ بھی ہیں جو انقلاب اور اسلام کے مستقبل کے غم میں ڈوبے تو رہتے ہیں لیکن کوئی عملی کوشش نہیں کرنا چاہتے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ انقلاب وغلبہ کی دشوار گزار گھاٹی کو یوں ہی آسانیوں کے ساتھ سر کرلیں اور ایسا اس لئے ہے کہ ان کے دل آزمائشوں اور مشکلات سے بے زار ہیں۔

مارے ہوئے ہیں ان میں بہت خانقاہ کے
سمجھے نہیں ہیں بھید ابھی لا الہ کے

تشریح:

عوام کا وہ گروہ جو تصوف کے زیرِ اثر رہا ہے، لا الہ کا ورد تو کرتا رہتا ہے لیکن وہ اس جملہ کی معنویت اور مقاصد سے بالکل بھی آشنا نہیں ہے، اگر وہ اس راز کو پہنچ جاتے تو ان کی کوششوں کا مرکز کچھ اور ہوتا۔

(شارح: شیر خالد)

●●●

اہم تحریکی سرگرمیاں

یک روزہ ڈویژنل اجتماع، سنبھل، یوپی

کاروان عقاب شجر کاری مہم، مہاراشٹر

پکنک پروگرام، بھساول، مہاراشٹر

یک روزہ میڈیا ورکشاپ، لکھنؤ، یوپی

آفس اجتماع، کلکتہ، مغربی بنگال

کاروان عقاب انچارجز میٹ آکولہ، مہاراشٹر

آل یوپی کاروان عقاب کوئز کمپیٹیشن

یک روزہ ڈویژنل اجتماع، گونڈہ، یوپی

دو روزہ ڈویژنل تربیہ پروگرام، اعظم گڑھ

RNI Number : MAHURD/2018/7738
Postal Reg No : G/Akl Dn/258/2019-21

فی ظلال القرآن

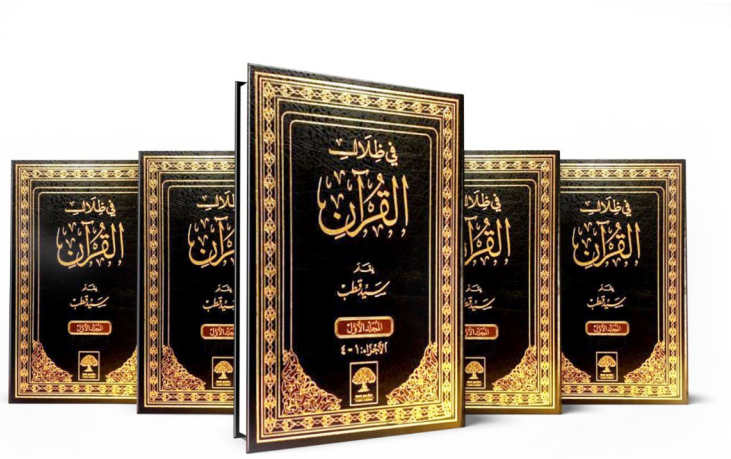

مصری عالم دین سید قطبؒ شہید کے ذریعہ زنداں (جیل) میں لکھی جانے والی عربی زبان کی مایاناز تفسیر کی اردو ترجمانی اپنی اصل روح کے ساتھ بذریعہ مولانا سید حامد علیؒ صاحب / مولانا مسیح الزماں فلاحی ندوی صاحب

اب ان شاء اللہ بہت جلد صرف 10 یا 11 جلدوں میں مزید آرائش و زیبائش کے ساتھ

- شُستہ ، شگفتہ اور عام فہم زبان میں اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر
- علمی ، فکری اور سائنٹفک تفسیر- دعوتی تربیتی اور انقلابی تفسیر- وجدانی اور ادبی تفسیر
- کسی قسم کی الجھن اور پیچیدگی کے بغیر مفاہیم قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کیلئے بہترین تفسیر
- اسلامی اجتماعیت کے اصول، طریق کار اور عروج و زوال کے اسباب پر سیر حاصل گفتگو
- اسلامی جماعت کے کارکنان کیلئے بہترین مشعل راہ
- عمدہ کاغذ، بہترین کتابت و طباعت اور پر کشش ٹائٹل

اس انقلاب انگیز تفسیر کا مکمل سیٹ اپنی لائبریری، مسجد اور گھر کیلئے ضرور منگائیں۔

اپنا آرڈر بک کرائیں

ORDER NOW

موبائل 9599693655

ای میل gpddelhi2018@gmail.com

شہد کو اپنے استعمال میں رکھیئے۔۔۔

اور بیجا بیماریوں سے نجات پایئے۔۔۔۔

Exquisite Nafees Honey Nafees name of quality and trust

نفیس شہد

NAFEES honey

100 % PURE

ہم لائے ہیں آپ کے لئے فارم کے بجائے

جنگلات کا خالص (اصلی) اور نفیس شہد

M.R.A. TRADERS

Opp. Alfa Tea House,Ardhapur,
Dist. Nanded. Mob: 7066665746

(Home delivery service available.)

نوٹ: فوڈ لیب میں نفیس شہد کو فارم کا یا ملاوٹی ثابت کرنے پر -/5000 کا انعام